حیدرآباد فرخندہ بنیاد سے شائع ہونے والا قدیم متوازن علمی وادبی ماہ نامہ

سب رس

مئی 2018ء
30/- روپے
ISSN-2278-6902

ادارۂ ادبیاتِ اردو حیدرآباد

جناب اے۔ کے۔ خاں، مشیر اقلیتی بہبود، حکومت تلنگانہ، سیول سرویس امتحان میں منتخبہ امیدوار جمیلہ فاطمہ زیبا کو تہنیت پیش کرتے ہوئے۔، جناب حبیب اللہ خاں (والد امیدوار)، پروفیسر ایس۔ اے۔ شکور، ڈائریکٹر / سکریٹری، تلنگانہ اردو اکادمی، جناب شاہنواز قاسم، جناب کے۔ ایم۔ عارف الدین، جناب ظفر جاوید، جناب ایوب علی خاں، ڈاکٹر فخر الدین اور جناب لطیف محمد خاں

ڈاکٹر رفیعہ سلیم نے ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یافتہ فکشن نگار پروفیسر بیگ احساس کے اعزاز میں ایک تہنیتی تقریب کا اہتمام کیا۔
(دائیں سے بائیں): جناب اسلم فرشوری، پروفیسر ایس۔ اے۔ شکور، (ڈائریکٹر / سکریٹری، تلنگانہ اردو اکیڈیمی)، پروفیسر بیگ احساس، پروفیسر کے۔ اپا راؤ (وائس چانسلر، یونیورسٹی آف حیدرآباد)، جناب مجتبیٰ حسین، پروفیسر اشرف رفیع، پروفیسر پی۔ ایچ۔ محمد اور ڈاکٹر رفیعہ سلیم

بنیاد گذار سید محی الدین قادری زورؔ

ماہنامہ

سب رس

حیدرآباد

جلد: ۸۰ شمارہ: ۵ ماہ: مئی سال: ۲۰۱۸ء

مجلس ادارت

❁ سرپرست: راجکماری اندرادیوی دھن راج گیرجی

❁ صدر: جناب زاہد علی خاں

❁ معتمد عمومی: پروفیسر ایس۔اے۔شکور

مجلس مشاورت

❁ پروفیسر گوپی چند نارنگ

❁ جناب مجتبیٰ حسین

❁ پروفیسر اشرف رفیع

مدیر

پروفیسر بیگ احساس

زرِسالانہ

❁ ہندوستان: **300** روپے

❁ پاکستان وبنگلہ دیش: 600 روپے

ٹائٹل: عزیز آرٹسٹ

قیمت: -/30

❁ کتب خانوں سے: **400** روپے

❁ مغربی وعرب ممالک سے 60 ڈالر یا 40 پاؤنڈ

Phone: 040-23313311 **Editor: 9849256723** Fax: 040-23374448

مراسلت وترسیل زر کا پتہ: ایوان اردو، پنجہ گٹہ روڈ، سوماجی گوڑہ، حیدرآباد .082 500 انڈیا

برقی پتہ: *E-mail: idarasabras@yahoo.in*

چیک یا ڈرافٹ: **The Sabras Monthly, Hyderabad** کے نام سے ارسال کریں۔

بیرون حیدرآباد چیک کلیرنگ چارجس -/60 روپے زیادہ

رسالے کی عدم دستیابی سے متعلق شکایت فون نمبر: 9949303546 / 9032566731 پر کیجیے۔

پرنٹر و پبلشر پروفیسر ایس۔اے۔شکور نے طہٰ پرنٹ سسٹمس، لکڑی کا پل میں طبع کرواکے ادارۂ ادبیات اردو سے شائع کیا۔

کلونجی

خواتین کیلئے قیمتی تحفہ

زیادہ سے زیادہ خواتین ہمارے بیوٹی پروڈکٹس کی منفرد کوالٹی کو محسوس کررہی ہیں۔
آپ کی بہتر سے بہتر انداز میں خدمت پر ہمیں فخر ہے۔
آپ کے حسن کیلئے اس سے بہتر کچھ نہیں۔

خواتین کا مند پسند اور آزمودہ نسخہ

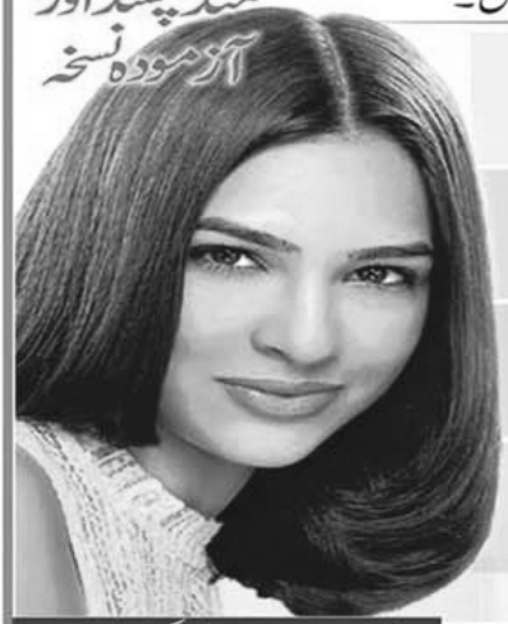

زم زم بہار ہیئر آئیل
• بالوں کا جھڑنا روکتا ہے۔ • سر میں بفادور کرتا ہے۔ • بالوں میں تازگی پیدا کرتا ہے۔ • بالوں کو لمبا کرتا ہے۔ • بالوں کی جملہ شکایات کیلئے مفید ہے۔ • سر درد دماغی سکون کے علاوہ چین کی نیند کیلئے مفید ہے۔

کلونجی فیرنس کریم
• چہرے سے داغ دھبے دور کرتا ہے۔
• جھائیوں اور زائد تیل کو نکالتا ہے۔
• چہرے کی جلد کی رنگت کو گورا ملائم اور خوبصورت بناتا ہے۔

کلونجی پمپل کریم
• چہرے کے کیل مہاسے • باریک داغ • چہرے کے جملہ داغ مٹاتا ہے • چہرے پر پیدا ہونے والی جھریوں کو ختم کرتا ہے • آنکھوں کے نیچے کالے حلقوں کو دور کرتا ہے۔

کلونجی ہربل ٹوتھ پاؤڈر
دانتوں کے جملہ امراض، دانت کا ہلنا، دانت میں تکلیف، دانت کا کیڑا، منہ سے بدبو آنا وغیرہ میں نہایت مفید ہے

آپ بھی آزما کر دیکھئے

ہمارے دیگر پراڈکٹس

- کلونجی تیل • کلونجی مساج آئیل • کلونجی پین بام • سفوف ظہیر • اکسیر معدہ
- سفوف اپسرا • سفوف دمہ • کلونجی شوگر پاؤڈر • کلونجی چیون پراش
- اکسیر جگر • معجون کلونجی • کلونجی شیمپو پاؤڈر • مرہم کافوری • روغن گیسو دراز

حسن بے مثال کی شان
جو دیکھے یہی کہے، بہت حسین لگتی ہے۔

Mfg. Lic. No. 327/DU/98

MFG. MOHAMMEDIA PRODUCTS
Karim Nagar, (A.P.)

MRKT. BY S.J. AGENCIES
Opp : Rama Krishna Theatre, J.N.Road, Abids.
Ph : 66621834, 9346669505, 9346209091

ہمارے پراڈکٹس تمام میڈیکل ہال، دواساز اور جنرل اسٹورس پر دستیاب ہے

اس شمارے میں

اداریہ

	بیگ احساس	6

مضامین

جنوبی ہند کے ایک بلند پایہ صوفی شاعر حضرت شہمیر ثالثؒ کڈپوی	راہی فدائی	9
سرسید اور علامہ اقبالؔ: ہم آہنگیٔ فکر و عمل	صغیر افراہیم	17
میرانجی شمس العشاق کا سنہ پیدائش و وصال	حبیب نثار	22
فکر تونسوی: شخصیت اور طنز و مزاح نگاری	عبدالحئی	29

خودنوشت

ڈگر سے ہٹ کر قصہ پارینہ	سیدہ بانو احمد	36

آپ بیتی

یادیں	راجکماری اندرادیوی دھن راج گیرا اشرف رفیع	44

طنز و مزاح

ادیبوں کی جنگِ زرگری	خامہ بگوش	49

شاعری

پی پی سریواستورند، مسلم نواز، مصداق اعظمی، ہارون شامی،	بدر محمدی، انور ادیب، احمد نثار، ابرار نغمی	52

افسانے

حادثہ-2	بلراج بخشی	59
سماج	مشتاق احمد وانی	65
میں تم سے	دانش اثری	67

مطالعہ

تخم خوں	انجم پروین	70

جو وہ لکھیں گے جواب میں

خطوط	مصداق اعظمی، محمد ناظم علی	78

اداریہ

جمہوریت پر فاشزم کے سائے!

ملک کے چار اہم ستون پارلیمنٹ، عدلیہ، ذرائع ابلاغ اور درس گاہیں، ان سب پر فاشزم کا خطرہ منڈلا رہا ہے۔ پارلیمنٹ کا یہ حال ہے کہ برسر اقتدار پارٹی نے اپوزیشن کی ایک نہ چلنے دی اور سارا وقت اور لاکھوں روپیہ ضائع کر دیا۔ مودی حکومت کے خلاف تحریک عدم اعتماد پیش کرنے کی اسپیکر نے منظوری ہی نہیں دی۔ ملک کی پارلیمنٹ برسر اقتدار پارٹی کے اشاروں پر چل رہی ہے۔ راجیہ سبھا کے صدر نشین نے سپریم کورٹ کے چیف جسٹس دیپک مشرا کے خلاف کانگریس اور سات اپوزیشن پارٹیوں کے ممبران پارلیمنٹ کو مواخذے کی تحریک پیش کرنے کی اجازت ہی نہیں دی اور ان کی نوٹس کو یکسر مسترد کر دیا۔ کانگریس کے علاوہ دوسری سات اپوزیشن پارٹیوں کے ممبران پارلیمنٹ نے سپریم کورٹ کے چیف جسٹس پر عہدے کے غلط استعمال اور امتیازی سلوک کے پانچ سنگین الزامات عاید کرتے ہوئے مسٹر وینکنا نائیڈو کو چیف جسٹس کے خلاف مواخذے کی تحریک کا نوٹس دیا تھا۔ خرب مخالف نے پریس کانفرنس میں کہا کہ چیف جسٹس نے اپنے عہدے کی عزت و وقار کی خلاف ورزی کی ہے ان کے خلاف مواخذے کی نوٹس دینے کے علاوہ کوئی متبادل راستہ نہیں ہے۔ مسٹر نائیڈو نے اس تحریک کو جس طرح مسترد کر دیا اس کی مثال ماضی میں نہیں ملتی یہ غیر قانونی فیصلہ ہے۔ مسٹر نائیڈو کے اس حکمنامے کو قانونی نظام کے لیے خطرہ قرار دیا گیا۔

حیدرآباد کی عدالت نے مکہ مسجد 2007ء کے بم دھماکوں کے ملزمین کو بری کر دیا۔ مکہ مسجد بم دھماکوں کے شہدا، اں جہانی جسٹس لویا اور گجرات کے نروڈا پاٹیہ کے مظلوموں کی روحیں عدالت کے اس فیصلے سے بے چین ہوگئی ہوں گی۔ مکہ مسجد بم دھماکوں کا فیصلہ آیا جس میں خصوصی این آئی اے عدالت کی جانب سے تمام ملزمین کو بری کیے جانے پر تحقیقاتی ایجنسی پر ایک سوالیہ نشان قایم ہوتا ہے اس کیس میں سینکڑوں بے گناہ مسلمانوں پر بے سروپا الزامات عاید کر کے جیلوں میں ٹھونس دیا گیا تھا۔ آں جہانی ہنمنت کرکرے نے ہندو دہشت گردی کا پردہ فاش کیا تھا اس کے بعد نہ صرف مکہ مسجد، اجمیر، مالے گاؤں اور سمجھوتہ ایکسپریس بم دھماکوں میں بھی زعفرانی دہشت گردوں کی گھناؤنی سازشیں منظر عام پر آئیں۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے بھگوا آتنک وادی تفتیشی ایجنسیوں کی گرفت میں آتے گئے۔ 26/11 کی دہشت گردی میں آں جہانی ہنمنت کرکرے کو ختم کر دیا گیا۔ 2014ء میں حکومت کی تبدیلی کے بعد ان دہشت گردوں کی قسمت کھل گئی۔ حکومت نے ان ملزموں کو رہا کروانے کے لیے این آئی اے کا استعمال کیا۔ مالے گاؤں کیس کے ملزمین سادھوی پرگیہ سنگھ ٹھاکر اور دیگر کے خلاف سخت گیر قانون مکوکا کی دفعات ہٹائی گئیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ مکہ مسجد بم دھماکوں کی برات کے بعد جج رویندر ریڈی نے استعفیٰ دے دیا۔ یہ اقدام انھوں نے ضمیر کی آواز پر کیا ہوگا لیکن ہائی کورٹ نے ان کا استعفیٰ نامنظور کر دیا اور وہ دوبارہ رجوع ہوگئے۔ غالباً ایسا انجانے خوف کے زیر اثر کیا ہوگا۔

دوسرا فیصلہ سہراب الدین شیخ فرضی ان کاؤنٹر کیس کے سابق جج جسٹس برج گوپال ہرکشن لویا معاملے میں عدالت عظمیٰ کی

جانب سے آیا۔ چیف جسٹس دیپک مشرا نے جسٹس لویا کی ''پراسرار موت'' کی تحقیقات کا مطالبہ کرنے والی تمام درخواستوں کو خارج کر دیا۔

تیسرا فیصلہ گجرات کے بدترین نروڈا پاٹیہ مسلم کش فسادات کیس میں آیا جس میں بی جے پی کی سابق وزیر مایا کوڈنانی کو بری کر دیا گیا۔ سوال یہ ہے کہ سابق خصوصی عدالت نے کوڈنانی کو 28 / برس سزائے قید کس بنیاد پر سنائی تھی؟ ہائی کورٹ پہنچتے پہنچتے ایک دم کایا پلٹ کیسے ہوگئی۔ امیت شاہ بھی صاف بچ گئے اور مایا کوڈنانی کو خود گواہی دے کر بچا لیا۔ تمام ملزمین (بھگوا) کے اچھے دن آ گئے۔ عدالتوں پر سے عوام کا ایقان اٹھتا جا رہا ہے۔ ممکن ہے آصفہ کے کیس میں جو مجرم گرفتار ہوئے ہیں وہ بھی صاف بچ جائیں۔

اب آیئے درس گاہوں کی طرف! بی جے پی کا پہلا نشانہ، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی بنی۔ وہاں مسلسل طلبا کو تنگ کیا جا رہا ہے۔ نجیب کا کوئی پتہ نہیں چلا۔ حیدرآباد یونیورسٹی میں ایک کمزور طبقے کا اسکالر روہت ویمولہ خودکشی کرنے پر مجبور ہو گیا۔ کچھ دن ہنگامہ ہوا اب سب خیریت ہی خیریت ہے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ فرقہ پرستوں کو آنکھوں میں بہت کھٹکتی ہیں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طلبا یونین کے دفتر میں آویزاں محمد علی جناح کی تصویر کا بہانہ بنا کر ہنگامہ کھڑا کر دیا گیا۔ سابق نائب صدر حامد انصاری کا علی گڑھ دورہ بھی ایک وجہ ہے۔ ان کا دورہ منسوخ کرنا پڑا۔ بی جے پی کے رکن پارلیمنٹ ستیش گوتم نے ایک خط لکھ کر یونیورسٹی میں جناح کی تصویر آویزاں کیے جانے پر سوال پوچھا کہ ایسی کیا مجبوری ہوگئی تھی کہ جناح کی تصویر لگانی پڑی۔ طلبہ یونین کے صدر مشکور احمد عثمانی نے کہا کہ گوتم صاحب وی سی کو خط لکھنے کی بجائے یونین کے ذمہ داروں کو لکھتے کیوں کہ تصویر طلبا یونین ہال میں لگی ہے۔ یونیورسٹی کے ترجمان پروفیسر شافع قدوائی نے وضاحت کی کہ یہ تصویر غیر منقسم ہندوستان کے دور میں 1938ء سے لگی ہوئی ہے اور مسٹر جناح کو تاحیات رکنیت دی گئی تھی۔ لیکن شر پسندوں کو بہانہ چاہیے تھا۔ 2 / مئی کو زبردست ہنگامہ ہوا۔ تصویر ہٹوانے کا مطالبہ کرتے ہوئے ہندو واہنی، ہندو جاگرن منچ کے کارکنوں نے جلوس نکالا اور جناح کا پتلا جلایا۔ باب سید پر ہندو کارکن اور یونیورسٹی کے طلبا آمنے سامنے ہو گئے۔ پولیس بھی پہنچ گئی اور دونوں گروہوں کو الگ کرنے کی کوشش کی۔ اس درمیان پولیس اور طلبا میں جھڑپ ہوگئی۔ طلبا نے سنگباری کی۔ پولیس نے بے رحمی کے ساتھ لاٹھی چارج کیا آنسو گیس کے شل برسائے۔ کئی طلبا سخت زخمی ہوئے۔ یونین کے صدر مشکور احمد عثمانی نے سوال کیا کہ پارلیمنٹ میں ساورکر کی تصویر کیوں لگی ہے۔ بی جے پی میں مسٹر جناح کو لے کر سخت بحث چھڑی ہوئی ہے۔ چینلوں کو بھی موقع مل گیا کہ وہ ڈبیٹ کروائیں۔ ایک مسلمان ایک ہندو، ایک خاتون، ایک اپوزیشن پارٹی کا کارکن، میڈیا شور مچا رہا ہے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ مسلم یونیورسٹی میں موافق پاکستان قوم دشمن عناصر جمع ہو گئے ہیں۔ مسلمانوں اور مسلم تعلیمی اداروں کو قوم کے غدار قرار دیا جا رہا ہے۔ یونیورسٹی کا انٹرنیٹ بند کر دیا گیا ہے مسلم یونیورسٹی طالبات یونین کی حمایت کے سبب سینکڑوں کی تعداد میں اپنے آنچل کو پرچم بنا کر پہلی بار اتنی کثیر تعداد میں دھرنا کی جگہ پر پہنچ گئیں اس درمیان متعدد یونیورسٹیز و کئی ممالک سے سابق طلبا اور دیگر یونین کے عہدے دار، اے ایم یو اولڈ بوائز یونین کے کارکن وفد کی شکل میں پہنچ کر طلبا کی تائید میں تقریریں کیں۔ جے این یو طلبا یونین کی صدر گیتا کماری نے دھرنا کے مقام پہنچ کر کہا کہ ملک ہمارا ہے۔ آر ایس ایس کا نہیں ہم آزاد شہری ہیں ہمیں آئین نے حقوق دیئے ہیں ہم ان کا استعمال

کریں گے۔ بہار کے رکن پارلیمنٹ پپویادو بھی ضلع پولیس اور انتظامیہ کی تمام کوششوں کو ناکام بنا کر اے ایم یو پہنچ گئے۔

بہر حال طلبہ نے حکمت عملی سے کام لیا اور ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ لیکن خطرہ ٹلا نہیں ہے۔ پی جے پی حکومت کو اعلیٰ تعلیمی اداروں کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک ایک کر کے وہ تمام جامعات پر ضرب لگا رہی ہے۔ بنارس ہندو یونیورسٹی بھی اس سے بچی نہیں۔ غیر سماجی عناصر کی یہ کوشش ہے کہ فرقہ پرستی کے نام پر ہندو، مسلمان کو لڑایا جائے۔ اب اگر کرناٹک ہاتھ سے نکل جائے تو اور بھی اوچھے حربے استعمال کیے جائیں گے۔ ہماری سیکولرازم کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ جڑیں تازہ ہیں کچھ شاخیں سوکھی ضرور ہیں خزاں رسیدہ پتّے بھی شاخ سے ٹوٹ کر بکھر گئے لیکن ان جڑوں کو پانی دینے کی سخت ضرورت ہے تاکہ جمہوریت کی ان جڑوں سے ایک نیا درخت نکلے۔

ملک میں جمہوریت خطرے میں ہے اور لفظ ''سیکولرازم'' کو مٹانے کی بھرپور کوشش کی جا رہی ہے۔ یہی وقت ہے کہ ہم ہمارے ملک کی اچھی روایتوں کی بھرپور مدافعت کریں اور سیکولرازم کے حفاظت کریں۔ آصفہ کے کیس میں جہاں فرقہ پرستی کا بدترین مظاہرہ ہوا وہیں سیکولر مزاج رکھنے والے ہندو ہی یہ کیس لڑ رہے ہیں۔ اس لیے ہمیں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ایک عارضی وقفہ ثابت ہوگا بشرطیکہ ہم سازشوں کا شکار ہو کر اپنا تحمل نہ کھوئیں۔

ڈاکٹر ظفر کمالی نے محترم مجتبیٰ حسین پر ایک مضمون پی ڈی ایف فائیل میں بھیجا تھا۔ ان سے گزارش کی گئی کہ وہ ان پیج میں اپنا مضمون بھیجیں۔ رسالہ پریس جانے کے لیے تیار تھا۔ مجتبیٰ حسین صاحب کا اصرار تھا کہ وہ مضمون تازہ شمارے میں شامل ہو۔ عجلت میں ہم نے اس مضمون کو اس خیال سے شامل کر لیا کہ مصنف نے پروف ریڈنگ کے بعد ہی بھیجا ہوگا۔ جب مضمون شائع ہوا تو ہوش اڑ گئے۔ پورا مضمون کمپوزنگ کے غلطیوں کا پلندہ ہے۔ ہم اپنی اس غفلت پر شرمندہ ہیں اور قارئین سے معذرت خواہ ہیں۔ اس مضمون کو دیکھنے کے بعد بقول مجتبیٰ حسین، شاذ تمکنت کے برادر خورد ہمارے کرم فرما جناب امتیاز الدین صاحب نے پروف کی غلطیوں کو 'سب رس' کا ''طرہ امتیاز'' قرار دیا۔ 'سب رس' میں پہلے بھی پروف کی غلطیاں ہوتی رہی ہیں الحمدللہ اب وہ اس اعزاز کا مستحق ہو گیا ہے۔ ہم امتیاز الدین صاحب کے شکر گزار ہیں اللہ ان بزرگوں کا سایہ ہمارے سروں پر قایم رکھے۔ جو لوگ انٹرنیٹ پر مضامین ارسال کرتے ہیں وہ اچھی طرح پروف ریڈنگ کرنے کے بعد ہی ہمیں میل کریں۔ ورنہ ہمارے اعزازات میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ اعزازی مدیر ہونے کا ایک فائدہ یہ بھی ہے۔

اردو ادب کے عظیم نقاد، دانشور و شاعر اور روزنامہ انقلاب کے سابق مدیر فضیل جعفری کا انتقال 81 برس کی عمر میں ہوا۔ ڈیڑھ دو مہینے سے وہ بے حد بیمار تھے اور کینسر کے عارضہ میں مبتلا تھے، حیدرآباد کے مشہور شاعر جناب ستار صدیقی کا بھی انتقال ہو گیا۔ ستار صدیقی جدید لہجے کے شاعر تھے اور آخری عمر تک وہ لکھتے رہے۔ ان کا ایک نیا مجموعہ زیر طبع تھا۔ خدا مرحومین کی مغفرت فرمائے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

بیگ احساس

راہی فدائی

مضمون

جنوبی ہند کے ایک بلند پایہ صوفی شاعر حضرت شہمیر ثالثؒ کڈپوی

شعر گوئی دراصل بحرِ زخار کو پیالے میں سمونے کا عمل ہے، اور دہان صدف میں قطرۂ نیساں کو داخل کرنے کے مترادف ہے۔ شعر کے مختصر ترین منظر نامے میں وسیع وعریض کائنات کی جلوہ نمائی ممکن ہے۔ اس کا ایک ایک مصرعہ کبھی کبھی صدیوں کی تاریخ کا عکاس ہوتا ہے۔ بسا اوقات ضخیم ناول طویل افسانہ اور نوع بہ نوع مضامین کے مجموعہ کے لئے کسی اچھے شعر کا ایک مصرعہ بلکہ آدھا مصرعہ بھی بطور عنوان کافی ہوجاتا ہے اسی لئے اصناف ادب میں شعر کا مقام اعلی وارفع ہونے کا اعتراف تقریباً سبھی نقادوں نے کیا ہے۔ علاوہ ازیں شعر کی اثر آفرینی، دل آویزی اور مسرت خیزی اس کی وقعت واہمیت کی منہ بولتی تصویر ہی نہیں بلکہ دعوی مع الدلیل بھی ہے۔ غرض شعر وسخن کی خصوصیات کے پیش نظر اہل مال ومنال کے ہمدوش اصحابِ حال وقال بھی اس کی زلف گرہ گیر کے اسیر بنے ہیں چنانچہ اردو کے اولین شاعر حضرت گیسودراز بندہ نوازؒ (متوفی ۷۵۲ھ) سے جنوب کے مشہور صوفی شاعر حضرت عبدالحق شاہ میر ثالث بخاریؒ (متوفی ۱۳۵۴ھ) تک، سیکڑوں اولیاء وصوفیا، علما وعرفا اور اہل دل اصفیا نے شعر گوئی وسخنوری کو اپنے شب وروز کے مشاغل کا حصہ بنایا۔ یہ اور بات ہے کے ان بزرگوں کا مطمح نظر اور انکا شعری سفر، خواہش شہرت وعزت اور طلب منصب ودولت کے لئے قطعاً نہیں تھا۔ ان اہل اللہ کا مقصودِ اصلی ومطلوبِ دلی رضائے الٰہی کا حصول تھا، اسی غرض سے وہ حمد باری تعالی اور نعت حبیب کبریا ﷺ میں رطب اللسان رہتے تھے پھر اس کار خیر سے فرصت ملتی تو شاعری کے ذریعہ اصلاح خلقِ خدا کا بیڑا اٹھاتے تھے جس سے نہ صرف عوام وخواص کی اصلاح وفلاح ہوتی تھی بلکہ زبان وبیان اور علم وادب کی آبیاری بھی ہوجاتی تھی۔

حضرت سید شاہ عبدالحقؒ بخاری المعروف بہ شاہ میرؒ (ثالث) بن حضرت سید شاہ عبدالقادرؒ عبدؔ کڈپوی (متوفی ۱۳۰۰ھ) خانوادۂ شہ میریہ کے چشم و چراغ تھے۔ اس خانوادے کے بانی حضرت سید شاہ محمد حسینی بخاری المتخلص بہ شہ میر اولؒ (متوفی ۱۱۸۲ھ) بن حضرت سید شاہ جمال الدین بخاریؒ جمالؔ راچکوٹی (متوفی ۱۱۶۲ھ) بن سید شاہ کمال الدین بخاریؒ اول گرمکنڈوی (متوفی ۱۱۲۵ھ) صوفیٔ دوراں علامۂ زماں اور مرشدِ انس وجاں تھے۔ آپ کا سلسلہ نسب عالم اسلام کے معروف بزرگ حضرت سید جلال الدین حسینی المعروف مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ (متوفی ۷۸۹ھ) خلیفۂ حضرت نصیر الدین چراغ دہلویؒ (متوفی ۷۵۷ھ) سے ملتا ہے۔ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کی ساتویں پشت کے فرزند حضرت سید جمال الدین بخاری ملتانیؒ ابن حضرت سید کبیر الحق ثانی بخاریؒ کا نکاح حضرت سید محمد حسینی گیسودرازؒ کے چوتھے پشت کے فرزند حضرت سید شاہ حسنؒ ابن سید شاہ صفی اللہؒ کی دختر نیک اختر محترمہ خونزہ بی بی یا خندہ بی بی سے ہوا۔ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کے پانچویں جد اعلی حضرت سید محمد الملقب بہ سیف اللہ معروف بہ شمس الدینؒ (ولادت ۴۴۳ھ وفات ۵۲۹ھ) ابن حضرت سید محمود کنیت ابو السیفؒ (ولادت ۳۷۰ھ وفات ۴۶۷ھ) اس خاندان کے پہلے بزرگ ہیں جو بغداد سے ہجرت فرما کر بخارا (موجودہ ازبکستان) تشریف لائے اور یہیں متوطن ہوگئے۔ آپکی کئی پشتیں یہیں پیدا ہوئیں چنانچہ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ ابن حضرت احمد کبیر الحق اول

بخاریؒ (ولادت ۶۴۶ھ وفات ۷۵۹ھ غالباً) کے جدامجد یعنی احمد کبیر الحقؒ کے والد ماجد حضرت سید جلال الدین حیدر میر سرخ بخاریؒ (ولادت ۵۹۵ھ وفات ۶۹۰ھ) کی ولادت شہر بخارا میں ہوئی (۱) حضرت میر سرخ بخاریؒ مشہور عالم بزرگ حضرت شیخ بہاء الدین ذکریا ملتانیؒ (متوفی ۶۶۶ھ) کے خلیفۂ خاص تھے۔ میر سرخ بخاریؒ، سلطان علاء الدین نبیرۂ سلطان التمش (متوفی ۶۴۴ھ) کے عہد میں اوچھ (ملتان) تشریف لائے اور یہیں قیام پذیر ہوگئے (۲) بقول مولوی سخاوت مرزا، حضرت سید محمد اکبر بخاریؒ (حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کے تیسرے فرزند) کی اولاد میں سید جمال الدین بخاریؒ ملتانی بزمانۂ سلاطینِ عادل شاہیہ دکن آئے تھے۔ سید محمد اکبر بخاریؒ شہزادی روم کے بطن سے تھے..... کیونکہ سلطان یوسف عادل شاہ، بقول فرشتہ، ملک روم کا شہزادہ تھا۔ انہیں تعلقات کی وجہ سے قرین قیاس ہے کہ مولانا جمال الدینؒ ملتانی بیجاپور چلے آئے ہوں اور یہاں خواجہ سید محمد گیسودرازؒ کے خاندان میں شادی کی ہو (۳)۔ حضرت سید جمال الدین بخاریؒ شادی کے بعد کچھ عرصہ گلبرگہ میں قیام پذیر رہے پھر وہاں سے سلطان ابراھیم عادل شاہ ثانی (عہدحکومت ۹۸۸ھ تا ۱۰۳۷ھ) کے زمانۂ سلطانی میں بیجاپور تشریف لائے۔ یہیں آپ نے سلسلہء بندہ نوازؒ کے بزرگ حضرت سید شاہ ہدایت اللہ حسینیؒ (متوفی ۱۰۱۲ھ) کے دست حق پرست سے خرقۂ خلافت زیب تن فرمایا (۴) اور اپنے اہل وعیال کے ساتھ بیجاپور ہی میں توطن اختیار کرلیا۔ جب شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر (متوفی ۱۱۱۸ھ) کے ہاتھوں عادل شاہی حکومت کا خاتمہ ۱۰۹۷ھ مطابق ۱۶۸۶ء میں ہوگیا تو اس وقت تک حضرت جمال الدین بخاریؒ ملتانی اور آپکے فرزند سید حسن صوفیؒ کا وصال ہو چکا تھا لہٰذا آپکے پوتے حضرت سید شاہ کمال الدین بخاری اولؒ (متوفی ۱۱۲۵ھ) اپنے فرزند سید شاہ جمال الدین بخاریؒ اور پوتے کے ساتھ بیجاپور سے ترک وطن کرتے ہوئے شاہ نور (ساؤنور، ضلع ہاویری، کرناٹک) تشریف لائے وہاں کے جاگیردار نواب عبدالروف خان میانہ الملقب بہ دلیر جنگ سے آپکے روابط تھے، وہ آپ کا معتقد بھی تھا آپ نے وہاں ایک عرصہ قیام فرمایا پھر وہاں سے کرنول، بدویل، کڈپہ، رائچوٹی ہوتے ہوئے گرمکنڈہ میں آکر سکونت پذیر ہوگئے جوکہ میانہ حکمرانوں کی جاگیر تھی یہیں آپ کا وصال بتاریخ ۲۷ رجب المرجب ۱۱۲۵ھ کو ہوا اور تالاب کے کنارے ایک چبوترے پر واقع آپ کی آخری آرام گاہ آج بھی مرجع خاص وعام ہے۔

حضرت سید کمال الدین اولؒ کی وفات حسرت آیات کے بعد آپ کے تین فرزندوں سید یعقوب بخاریؒ، سید یداللہ بخاریؒ اور سید جمال الدین بخاریؒ میں سے چھوٹے فرزند سید جمال الدین بخاریؒ گرم کنڈہ سے شہر رائچوٹی تشریف لائے۔ رائے چوٹی شہر کڈپہ سے پچاس کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اُس وقت رائچوٹی کڈپہ کے حکمراں نواب عبدالنبی خاں میانہ (دورحکومت ۱۱۱۴ھ تا ۱۱۵۸ھ) کے سات فرزندوں میں سے پانچویں صاحب زادے نواب عبدالحسین خاں میانہ عرف حسین میاں کی جاگیر تھی (۵)، نواب حسین میاں حضرت سید جمال الدینؒ کا معتقد خاص تھا، اسی کے اصرار سے آپن نے رائچوٹی کو اپنا مستقر بنا لیا۔ حضرت جمال الدینؒ کے آٹھ صاحب زادے اور تین صاحب زادیاں تھیں۔ بقول مصنف ''تجلیات نورانی'' حضرت سید جمال الدینؒ راہشت فرزند وسہ دختر بودند۔ میراث باطنی بہ سید محمد حسینی شاہ میرؒ صاحب رسید کہ فرزند کلاں اززوجۂ کلاں بودند" (۶) یعنی حضرت سید جمال الدین کو آٹھ لڑکے اور تین لڑکیاں تھیں، آپ کی میراث باطن آپ کے بڑے صاحب زادے حضرت محمد حسینی شاہ میرؒ کو عطا ہوئی جو بڑی بیگم کے بطن سے تھے۔

حضرت شاہ جمالؒ عالم و فاضل اور صوفیٔ کامل، پیر طریقت کے علاوہ شاعر بھی تھے۔آپ کی ایک مناجات راقم الحروف نے" کڈپہ میں اردو" میں تحریر کی ہے (۷) علاوہ ازیں آپ بہترین کاتب بھی تھے، آپ کی کتابت کا نمونہ امام محمد بن عبد الکریمؒ شہرستانی کی تصنیف "الملل والنحل" کی نقل میں دیکھا جاسکتا ہے جسے آپ نے بمقام بدویل (کڈپہ ضلع) ۱۱۳۱ھ میں زیب قرطاس فرمایا تھا۔ یہ مخطوطہ کتب خانہ سعیدیہ حیدرآباد کا مخزونہ ہے۔آپ ۱۱۶۲ھ میں واصل بحق ہوئے، مزار رایچوٹی میں ندی کے کنارے واقع ہے۔

آپ کے فرزند حضرت سید محمد حسینی معروف بہ شہ میر اولؒ کی ولادت ۱۰۸۲ھ مطابق ۱۶۷۱ء میں بمقام بیجاپور (کرناٹک) ہوئی، جبکہ وہاں سلطان علی عادل شاہ ثانی (متوفی ۱۰۸۳ھ مطابق ۱۶۷۲ء) کی حکومت کا آخری دور چل رہا تھا۔آپ کی ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد کے زیر ظل عاطفت ہوئی ۔ جب ۴ ذی قعدہ ۱۰۹۷ھ مطابق ۱۵/اکتوبر ۱۶۸۶ء (۸)' عادل شاہی حکومت کے آخری حکمران سلطان سکندر عادل شاہ (متوفی ۱۱۱۱ھ مطابق ۱۶۹۸ء) نے قلعہ کی کنجیاں شاہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر (متوفی ۱۱۱۸ھ) کے حوالے کردیں تو حضرت شہ میرؒ اپنے دادا اور والد کے ہمراہ پندرہ سال کی عمر میں ساؤنور آگئے اور یہاں کے طویل مدت قیام کے دوران آپ نے والد سے مزید تعلیم حاصل کی پھر انہیں کے مشورے سے شہر بیدر روانہ ہوگئے ۔ بیدر میں واقع بہمنی سلطنت کے وزیر اعظم خواجہ جمال الدین محمود گاواں شہید (شہادت ۸۸۶ھ) کا قائم کردہ عظیم الشان مدرسہ تمام عالمِ اسلام میں مشہور تھا۔ اُن دونوں اس شاہی مدرسہ کے ناظم و مہتمم امام المدرسین مولانا محمد حسین نائطی شہیدؒ (شہادت ۱۱ رمضان ۱۱۰۸ھ) تھے۔ حضرت شہ میر اولؒ نے مدرسہ محمود گاواں میں داخلہ لیا اور چند ہی برس میں آپ نے تمام علوم عقلیہ ونقلیہ میں مہارت تامہ وفراغت حاصل کرلی۔آپ امام المدرسین کے چہیتے شاگرد تھے اور استاذ آپ کی اعلیٰ علمی صلاحیت، بے مثال تقوی وطہارت کی وجہ سے آپ کی بڑی عزت وقدردانی فرماتے تھے جس کا اظہار امام المدرسین کے مکتوبات (قلمی) سے ہوتا ہے (۹) آپ نے باطنی تربیت اپنے پدر بزرگوار سے حاصل کی ۔طریقت ومعرفت کے منازل طے کرنے کے بعد حضرت جمال الدینؒ نے آپ کو خرقۂ خلافت سے سرفراز فرمایا۔ والد کے انتقال کے بعد آپ نے رایچوٹی کے قیام کو ترک کیا اور کڈپہ چلے آئے جہاں ایک مدت تک اشاعت دین وتبلیغ شرع متین کے سلسلہ میں مصروف کار رہے ۔آپ تشنہ گان علم کو تفسیر وحدیث اور فقہ وفلسفہ کی تعلیم سے سیراب کرنے کے ساتھ ساتھ سالکان طریقت کی اصلاح وتربیت پر بھی توجہ خاص فرماتے تھے۔آپ اپنے وقت کے علامہ تھے اور صاحب تصرف بزرگ تھے، علاوہ ازیں آپ اردو، فارسی کے بہترین شاعر ونثار بھی تھے۔آپ نے نظم ونثر میں کئی کتابیں تصنیف کیں جن میں انتباہ الطالبین ،اسرار التوحید ،رسالہ عینیت و غیریت کافی مشہور ہوئیں۔آپ نے شاعری بھی کی مگر آپ کے کلام کا بیشتر حصہ محفوظ نہ رہ سکا، تاہم آپ کا تذکرہ" تاریخ ادب اردو" میں بحیثیت دکنی نثر نگار شامل ہے۔ آپ اپنے آخری ایام میں نواب تلپول (علاقہ کدری، ضلع انت پور، آندھرا پردیش) عبدالقدوس خاں میانہ کے خواہش واصرار پر شہر تلپول تشریف لے گئے جہاں آپ کا وصال ۳ جمادی الاول ۱۱۸۶ھ کو ہوا۔آپ کا مرقد صدیوں سے زیارت گاہ خاص وعام بنا ہوا ہے۔

حضرت سید عبدالحق شاہ میر ثالثؒ خانوادۂ شہ میریہ کے انہیں بزرگ یعنی حضرت سید محمد حسینی الملقب بہ شہ میر اولؒ کی پانچویں پشت کے فرزند ہیں، جنہیں علم وعرفان کے ساتھ شعر

وادب کا ذوق بھی ورثہ میں ملا تھا۔ یہ بات بڑی حیرت انگیز ہے کہ ہندوستان کے معروف ومعتبر سلاسل سادات کے خانوادوں کے برعکس اس شہ میری سلسلہ کے اکثر بزرگ بہ یک وقت صوفی و عالم فقیہ وشاعر اور ادیب وواعظ رہے ہیں۔ چنانچہ حضرت شہ میر اولؒ المتخلص بہ میرؔ کے والد حضرت شاہ جمال اللہ جمالؔ اور حضرت شہ میر اولؒ کے دونوں برادران حضرت سید نوراللہؒ نورؔ اور جامئی دکن حضرت سید کمال اللہؒ کمالؔ کے علاوہ حضرت سید علی شاہ بخاریؒ لامعؔ ابن حضرت شاہ کمالؒ، حضرت سید شاہ محمد حسینی عرف شہ میر بخاری دومؒ المتخلص بہ بیرنگؔ ابن حضرت جیلانی باشاؒ ابن شہ میر اولؒ، حضرت شاہ جمال ثانیؒ ابن حضرت بیرنگؒ، حضرت سید جلال الدین یوسف علی شاہؒ اکملؔ ابن حضرت شاہ کمالؒ، حضرت سید شاہ سلطان محی الدین بخاریؒ سالکؔ ابن حضرت سید شاہ حسینی باشا بخاریؒ بن حضرت نورؒ، حضرت سید عبدالقادر بخاریؒ عبدؔ ابن حضرت سید جمال ثانیؒ ابن حضرت بیرنگؔ، حضرت سید علی مرادشاہؒ افضلؔ ابن حضرت اکملؒ، حضرت سید فقیر محی الدین بخاریؒ مقبلؔ بن حضرت اکملؔ وغیرہ سلسلہ شہ میریہ کے اکابرِ طریقت کے اسمائے گرامی مذکورہ حقیقت کو آشکارا کرنے کے لئے کافی ہیں، یہاں بطور نمونہ متذکرہ بالا بزرگوں کا ایک ایک شعر پیش کیا جارہا ہے تاکہ ہمارے دعوے کی مکمل تصدیق فراہم ہو:

۱) حضرت جمالؔ اولؒ رائچوٹی (متوفی ۱۱۶۲ھ)

سدا ہے رات دن مجھ کوں سو تیرا دھیان یا اللہ
کہ تجھ بن ایک تل نہ ہوئے اطمینان یا اللہ

۲) حضرت شہ میر اولؒ میرؔ (متوفی ۱۱۸۲ھ)

تیرا خدا ہے جو کہ ترے سے جدا نہیں
جو کوئی جدا ہے تجھ سے وہ تیرا خدا نہیں

۳) حضرت نوراللہؒ نورؔ (متوفی ۱۲۱۴ھ)

خامۂ عنبر فشاں سوں ہے ثنا سبحان کا
جس کو لائق ہے اُولھانا خلق پر احسان کا

۴) حضرت جامئی دکنؒ شاہ کمالؔ (متوفی ۱۲۲۴ھ)

یہ صافئی رو، یہ ہر دو ابرو، یہ قدِّ دل جو، یہ چشم جادو
مثالِ درپن، ہلالِ روشن، نہالِ گلشن، غزالِ صحرا

۵) حضرت لامعؔ (متوفی ۱۲۲۷ھ)

جو منازل نہ کیا طے مہ انور نہ ہوا
کونسا آبلہ پا ہے جو خوش اختر نہ ہوا

۶) حضرت بے رنگؔ (متوفی ۱۲۶۵ھ)

سر میں سودائے محمدؐ ہے میں دیوانہ ہوں
شمع احمدؐ ہیں تو میں شمع کا پروانہ ہوں

۷) حضرت جمالؔ ثانیؒ (متوفی ۱۲۶۴ھ)

سیہ مستوں کو ان آنکھوں کے میخانے سے کیا نسبت
یمِ عشرت کے گردابوں کو پیمانے سے کیا نسبت

۸) حضرت اکملؒ (متوفی ۱۲۷۷ھ)

یاں زبانِ قلم، قلم ہووے
رکے دم اور بند فم ہووے

۹) حضرت سالکؒ (متوفی ۱۳۰۰ھ تقریباً)

ہے مرآتِ خدا سردار عالمؐ
محمدؐ عکسِ ذات بے نشاں ہے

۱۰) حضرت عبدؒ (متوفی ۱۳۰۰ھ)

محمدؐ سرِّ حق رمزِ الٰہی
محمدؐ رازِ حق کا رازداں ہے

۱۱) حضرت افضلؒ (متوفی ۱۳۱۰ھ)

ذکر پیغمبر کا ہے جلدی نہ میں حاشا کروں
وصف شاہ دیں کا ہے آہستہ آہستہ کروں

۱۲) حضرت مقبلؒ (متوفی ۱۳۴۶ھ)

ذیل غم، روئے قلق، فرق بکا، قلب الم
انہیں حرفوں سے مرکب ہے تخلّص اپنا

ذیل غم، روئے قلق، فرق بکا، قلب الم
ذیل غ+م، روئے ق+لق، فرق کا، قلب
م + ق + ب + ل

مقبل

انہیں حرفوں سے مرکب ہے تخلّص اپنا

حضرت سید عبدالحق شاہ میر ثالثؒ کے اس خاندانی علمی وادبی وسیع پس منظر میں بجا طور پر یہ اعتراف کیا جانا چاہئے کہ آپ کو علم وعرفان کے دوش بدوش شعروسخن کا کمال بھی ورثے میں ملا ہے۔ آپ کے کلام میں اپنے والد ماجد حضرت سید عبدالقادرؒ عبدؔ، جدامجد حضرت سید جمال الدینؒ جمالؔ (ثانی) اور پردادا حضرت سید محمد حسینیؒ شہ میر (ثانی) بے رنگؔ کا رنگ و اثر نمایاں ہے۔ سلاست وروانی کے ساتھ صنائع وبدائع کا استعمال بھی خوب ہوا ہے۔ حمد نعت، سلام ومنقبت اور نظم وغزل سبھی اصناف میں آپ کی طبّاعی اور درّاکی صاف دکھائی دیتی ہے۔ آپ کے اشعار کا غالب موضوع احسان ومعرفت ہے جس میں اصلاحِ معاشرت وفلاح انسانیت کو خاص اہمیت دی گئی ہے، باایں ہمہ آپ کی یہ موضوعاتی شاعری جمالیت سے بھر پور ہے، نکاتِ سخن کا جابجا استعمال قلب ونظر کی کشش کا باعث ہے۔ آپ کا دیوان تقریباً ڈھائی ہزار (۲۵۰۰) اشعار پر مشتمل ہے جس میں شامل حمد، نعت، سلام اور منقبت کا وافر حصہ اردو کے مشاہیر شعرا کے مقابل رکھنے کے قابل ہے۔ چونکہ آپ کے مشرب ومسلک کی اصل و بنیاد تصوف وسلوک ہے اسی لئے اشعار میں اس کی جلوہ نمائی دیدہ ودل کو خیرہ کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ آپ نے اپنے کلام میں صوفیانہ اصطلاحات کا بھی بے تکلف مگر حسین پیرائے میں اظہار فرمایا ہے۔ چونکہ آپ عربی وفارسی کے ماہر اور مقامی زبان تلگو سے بھی واقف تھے اس لئے آپ کی تخلیقات میں دیگر زبانوں کی روایات کی جھلک غیر فطری نہیں ہے۔ یہاں آپ کے دیوان سے نمونتاً چند اشعار پیش کئے جارہے ہیں:

حمد:

لائق حمد وثنائے دوجہاں تو ہی تو ہے
خالقِ ارض و سماء کون ومکاں تو ہی تو ہے
غیب میں تو، کُنْتُ کَنْزًا مخفیاً کہتا رہا
اَیْنَمَا کہہ کر شہادت میں عیاں تو ہی تو ہے
باغ تو، غنچہ تو، گُل تو، نخل تو، اور بار تو
مالک گلزار تو ہی باغباں تو ہی تو ہے
مئے تو، مینا تو، سُبو تو، جام تو، نشّہ بھی تو
تو ہی مئے خانہ وشاہِ مئے کشاں تو ہی تو ہے
کہتے ہیں پڑھ کر دلیلِ اینما کو شاہ میرؔ
خلق اور مخلوق کا عکس ونشاں تو ہی تو ہے

نعت:

مشتاق ہوکے دیدِ رسولِ انامؐ کا
آیا ہوں لے کے تحفہ درود و سلام کا
صہبائے عیش سے مجھے دنیا کے کیا غرض
میں تشنہ لب ہوں ساقیِ کوثر کے جام کا
خالق رحیم ہے تو پیمبر شفیع ہیں
کچھ خوف و غم نہیں مجھے روزِ قیام کا
میں مثلِ عندلیبِ چمن پھول پھول کر
نغمہ سناؤں وصفِ رسولِ انام کا
سودا ترا جو سر میں سمایا ہے یا نبیؐ

قیدی ہے مرغِ دل ترے گیسو کے دام کا
مشہور ہے اگر چہ مرا نام شاہ میرؔ
لیکن غلام ہوں میں نبیؐ کے غلام کا

منقبت:

کرو مجھ پہ اپنا کرم غوثِ اعظم
دکھادو مبارک قدم غوثِ اعظم
لگے ہیں غمِ ہجر کے تیر دل پر
نہیں مجھ میں باقی ہے دم غوثِ اعظم
میں نالاں ہوں اب تابِ فرقت نہیں ہے
مرے دونوں ہیں چشم نم غوثِ اعظم
تپش حشر میں جل کہ ہو حد سے زاید
مجھے لیجے زیرِ علَم غوثِ اعظم
شہنشاہ جیلاں ہو تم اور تمہارے
ملازم ہیں دارا و جم غوثِ اعظم
دعا ہے کہ شہ میرؔ کے دور ہوں سب
غم و رنج ودرد و اَلم غوثِ اعظم

غزل:

یا ر بیٹھا ہے مرے دل ہی کے ویرانے میں
وہ ہے کعبے میں نہ مسجد میں نہ بت خانے میں
جان دیتا ہے وہ شہ میرؔ جو سن لیتا ہے
یہ ہے تاثیر مرے عشق کے افسانے میں
عشق ہے ایک رشک یوسف کا
ہے زلیخا سے بڑھ کے چاہ مری
دیکھو رخسار ماہ روکے طفیل
خوب روشن ہوئی گلی دل کی
لا مکاں میں کون تھا کون و مکاں میں اب ہے کون
کون ہے وہ ؟ مر کے جیتا 'جی کے مرتا کون ہے؟
جی کے مرتا ہوں مر کے جیتا ہوں
ہر طرح اختیار میں میں ہوں(۱۰)

حضرت مولانا قاری حکیم سید شاہ شاہ میر ثالثؒ کی ولادت بمقام کڈپہ ۱۲۸۷ھ مطابق ۱۸۷۱ء میں ہوئی۔ابتدائی تعلیم والد کے زیر سرپرستی جاری ہی تھی کہ والد حضرت عبدؒ ۱۳۰۰ھ میں انتقال کر گئے ،حقیقی جد بھی حیات نہیں تھے، لہٰذا آپ کی تعلیم و تربیت کی تمام تر ذمہ داری آپ کے نانا حضرت سید علی مراد شاہ افضلؒ نے سنبھالی۔آپ کو تفسیر' حدیث' فقہ' تصوف اور طب وحکمت کی مبادیات سے مطولات تک کی تعلیم خود ہی دی، بعد ازاں تقریباً بائیس ۲۲ سال کی عمر میں ۱۳۰۹ھ میں خاندانی بیعت وخلافت سے سرفراز فرمایا۔حضرت شہ میرؒ کی نثری تصانیف میں حقیقت محمدیہ، فضائل توبہ، گلدستۂ اشرف العالمین، منازل المصحف اور نصاب نصیحت نہ صرف مشہور ومقبول ہوئیں بلکہ کئی بار شائع بھی ہوئیں۔آپ کا دیوان آپ کے حینِ حیات مطبع فردوسی مدراس سے ۱۳۳۸ھ مطابق ۱۹۱۹ء میں شائع ہوا جو بیانوے(۹۲) صفحات پر مشتمل تھا۔ اس پہلے ایڈیشن کی طباعت پر مولانا سید شاہ عبد القدوس قادری قدسی بنگلوریؒ تلمیذِ جناب عرفیؔ مرحوم بنگلوری، جناب عطاؔ صاحب،مولانا حافظ سید محمد قاسم صاحب قاسمؔ مدرس مدرسہ لطیفیہ، حضرت مکان، ویلور، جناب محمد عبدالوہاب صاحب وہابؔ، جناب سید احمد بادشاہ نقشبندی صاحب احمدؔ، جناب محمد سلیمان صاحب پروازؔ، جناب محمد ارشداللہ خان صاحب فداؔ بنگلوری، جناب سہاؔ صاحب، جناب منشی غلام محمود مکّی صاحب محمودؔ تلمیذ مولانا حاجی میر محی الدین علی صاحب قادری چشتی اور جناب منشی محمد ابراہیم خان صاحب جوہرؔ ویلوری کے قطعاتِ تاریخ رقم ہیں۔

دیوان شہ میرؔ کا دوسرا ایڈیشن حضرت شاہ میر ثالثؒ کے

فرزندِ ارجمند حضرت مولانا سید شاہ قادر علی شہ میری ؒ (متوفی ۱۴۲۵ھ مطابق ۲۰۰۴ء) کے زیر اہتمام ۱۳۶۹ھ مطابق ۱۹۵۰ء میں برقی کوثر پریس بنگلور سے اشاعت پذیر ہوا جس میں پیش لفظ حضرتِ والا شمس العلماء حضرت خواجہ حسن نظامی دہلویؒ کا تعارف نامہ اور مولانا حکیم محمود بخاری مدظلہ العالی کا تحریر کردہ مضمون 'سوانح عمری حضرت شاہ میرؒ شامل ہے۔ آخر میں حضرت قادر علی شہ میریؒ کے تاریخی قطعات ہجری وعیسوی، مولانا عبدالرحمٰن جوہرؔ کرنولی ،جناب مولانا شیخ محمد عثمان شادؔ پونوی، جناب محمد عبدالقادر ظریف کڈپوی، جناب احمد شریف اشرفؔ بلہاروی، مولانا قاضی محمد کریم الدین زعیمؔ نندیالی' جناب لعل خان ادیبؔ کڈپوی، جناب مولانا الحاج محمد اسمٰعیل خان مائلؔ بنگلوری، جناب مولانا محمد جلال جلالؔ کڈپوی، مولانا سید حسین فرحتؔ کمالی بہاروی، جناب نواب طلعت اللہ خان صاحب نوابؔ کرنولی، جناب حکیم سید محمد صاحب ثناؔ دزیبائی بنگلوری، جناب حکیم عبدالمنتقم خان دانشؔ بنگلوری اور مولانا حکیم محمود بخاری مدظلہ العالی کے قطعاتِ تاریخ مرقوم ہیں۔

حضرت شاہ میر ثالثؒ نصف صدی سے زائد اشاعتِ سنت اور اصلاح امت میں ہمہ تن مصروف رہ کر ۳ رمضان المبارک ۱۳۵۴ھ مطابق ۱۹۳۵ء کو ملک عدم کوچ کر گئے انا للہ و انا الیہ راجعون آپ کا مزار مبارک شہر کڈپہ میں نہر داؤدی کے کنارے مسجد شہ میریہ کے صحن میں مرجع سالکین ملجأ معتقدین بنا ہوا ہے۔ محترم بخشی مصطفیٰ علی خان صاحب بخشی میسوری خلیفۂ حضرت سید پیر جماعت علی شاہ صاحبؒ اور مرحوم قدس سرہ کے صاحبزادے حضرت سید قادر علی شہ میریؒ نے قطعات تاریخ کہے ہیں:

قطعہ تاریخ از حضرت بخشی میسوری

عبد حق، والا نسب، عالی مقام
دستگیرِ بے کساں پیر زماں
ہر کہ او را دید شد شیدائے حق
در کلامش بود تسخیر زماں
گفت بخشیؔ خستہ جاں سال وصال
حق بہ حق پیوست شہ میرِ زماں

۱۳۵۴ھ

قطعہ تاریخ از حضرت قادر علی شہ میریؒ قادرؔ

واقف سرِّ باطن و ظاہر
پاک و پاکیزہ طیب و طاہر
سالک مسلکِ رسول انامؐ
عالمِ دیں، حدیث کے منبع
عارف منزلِ سلوک و حضور
دین و آلِ رسولؐ کے ناصر
ہر بلا پر تھے شکر کے سجدے
اللہ اللہ وہ صابر و شاکر
سچ تو یہ ہے وہ حق شناس تھی ذات
کیا کوئی مدح کر سکے شاعر
سال
ترحیل حضرت شہ میرؒ
مظہر معرفت کہو قادرؔ

۱۹۳۵ء

الحمد للہ اب ۱۴۳۸ھ مطابق ۲۰۱۷ء میں دیوان شاہ میرؔ کا تیسرا ایڈیشن خانوادۂ شہ میریہ کے چشم و چراغ اور حضرت شہ میر ثالثؒ کے پوتے اور حضرت سید قادر علی پاشا شہ میریؒ کے خلف اصغر حضرت مولانا شہ میر قادری شہ میر (رابع) مدظلہ کے زیر اہتمام وانصرام ادارۂ بزم شہ میر، تلپول، کدری سے زیور

طباعت سے آراستہ ہوکر حضرت شہ میر اولؒ کے دوسو باون (۲۵۲) ویں عرس شریف کے موقع پر منظر عام پر آرہا ہے۔ اللہ تعالی سے دعا ہے کہ اپنے حبیب پاک ﷺ کے طفیل اس دیوان کو شرف قبولیت سے نوازے اور اسے باذوق حضرات کے لئے استفادے کا باعث بنائے۔

آمین بجاہ سیدالمرسلین ﷺ.

ماٰخذوحواشی:

(۱) سخاوت مرزا مولوی، تذکرۂ حضرت سید جلال الدین مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ، مطبوعہ انسٹی ٹیوٹ آف انڈو میڈل ایسٹ کلچرل اسٹڈیس، حیدرآباد ۱۹۶۲ء/ص ۲۱

(۲) وایضاص/۹

(۳) وایضاص/۲۶۱، ۲۶۲

(۴) محمود بخاری سید حکیم، شہ میری اولیاؒ، بخاری بک ڈپو، محل (ضلع چتور آندھرا) بار چہارم ۲۰۱۶ء/ص ۵۲

(۵) راہی فدائی ڈاکٹر، گلمسس آف ہسٹری (GLIMPSES OF HISTORY) الانصار پبلی کیشنس، حیدرآباد مطبوعہ ۲۰۱۷ء/ص ۱۲۰

(۶) نوراللہ بخاریؒ سید شاہ برادر شہ میر اولؒ، تجلیات نورانی، مخطوطہ، مخزونہ کتب خانۂ شہ میریہ، کدری (آندھرا پردیش)

(۷) راہی فدائی ڈاکٹر، کڈپہ میں اردو، الانصار پبلی کیشنس، حیدرآباد، بار دوم ۲۰۱۲ء/ص ۵۱۔۵۲

(۸) محمد ابراہیم زبیریؒ حضرت، بساتین السلاطین، اردو ترجمہ محبوب الرحمٰن عمری مدنی، سیکیاب اسوی ایشن، بیجاپور (کرناٹک) مطبوعہ ۲۰۱۵ء/ص ۴۵۲

(۹) محمد یوسف کوکن عمری افضل العلماء، خانوادۂ قاضی بدر الدولہ جلد اول، دارالتصنیف، مدراس۔۱۴ مطبوعہ ۱۹۶۳ء /ص ۱۰۲۔۱۰۳

(۱۰) عبدالحق سید شاہ عرف شاہ میر ثالثؒ، دیوان شاہ میر، مطبوعہ بار اول ۱۹۱۹ء مطبع فردوسی، مدراس، بار دوم ۱۹۵۰ء مطبوعہ مکتبہ شہ میریہ، کڈپہ۔

☆☆☆

شرح

دیوانِ غالب

شارح

سید محمد ضامن کنتوری

مرتبہ

اشرف رفیع

قیمت: -/1200 روپے

-/800 طلباء ایڈیشن

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی

www.ephbooks.com

مضمون

سرسید اور علامہ اقبالؔ: ہم آہنگیٔ فکر و عمل

صغیر افراہیم

ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں کے قوائے علم و عمل کو حرکت میں لانے کے لیے سرسید کو جو مشکلات پیش آئیں اُنھیں سیدوالا گہر نے چیلنج سمجھ کر قبول کیا۔ علامہ اقبال سرسید کی زمانہ شناسی، دُور اندیشی اور جذبۂ فکر و عمل سے بے حد متاثر تھے۔ زمانی اعتبار سے دیکھا جائے تو اقبالؔ، سرسید سے ساٹھ برس چھوٹے تھے۔ خُرد اور بزرگ کا مقام عملی جدوجہد میں مانع نہیں ہوسکتا کیوں کہ سرسید اور اقبالؔ اس کے قائل نہیں تھے۔ دونوں کی ذہنی قربت کا بنیادی سبب انسانی فلاح و بہبود کا لامحدود جذبہ تھا۔ سرسید کی قائدانہ صلاحیت کا اعتراف کرتے ہوئے اقبال نے اپنے کئی فن پاروں میں واضح اشارہ کیا ہے کہ زوال زدہ معاشرے کو جس جرأت مند، رہبر انسان کی ضرورت تھی، وہ سرسید کی شکل میں قوم کو میسر آئی۔ اُن ہی کے الفاظ میں:

''سرسید کی ذات بڑی بُلند تھی، بڑی ہمہ گیر، افسوس ہے مسلمانوں کو پھر ویسا کوئی رہنما نہیں ملا''۔

مصلحِ قوم، تمام عمر برصغیر کے باشندوں کے خوابیدہ ضمیر کو فطری اصولوں کے تحت بیدار کرتے رہے۔ علامہ اقبال نے بھی اُنھیں کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے، اپنی مخصوص فکر کے ذریعے عالمی سطح پر مختلف مسائل کو سمجھنے اور سمجھانے کے جتن کیے۔ پروفیسر شکیل احمد اپنے مضمون ''ڈاکٹر علامہ محمد اقبال پر سرسید احمد خاں کے تصورِ مذہب کے اثرات میں رقم طراز ہیں:

''ہندوستان میں اسلام کی تشکیل نو کا جو سلسلہ سرسید احمد نے شروع کیا تھا، علامہ اقبالؔ بھی اُسی سلسلہ کی ایک کڑی تھے۔ سرسید احمد اور اقبالؔ کے خیالات میں جو ہم آہنگی تھی اس کی حدود کا تعین کرنا خاصہ مشکل کام ہے۔ اقبال ابتدا ہی سے علی گڑھ تحریک سے متاثر تھے کیوں کہ جس ماحول میں اقبالؔ نے آنکھ کھولی اس وقت علی گڑھ تحریک کے اثرات غالب تھے''۔ (ص:۷۵)

سرسید سے اقبالؔ کی بے پناہ عقیدت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ سرسید کا ذکر بچپن سے اپنے اُستاذ مکرم سید میر حسن سیالکوٹی سے سُنا کرتے تھے، جو جنون کی حد تک سرسید کے شیدائی تھے۔ اِس وساطت کا اعتراف انھوں نے خود کیا ہے:

مجھے اقبال اس سید کے گھر سے فیض پہنچا ہے پلے جو اس کے دامن میں وہی کچھ بن کے نکلے ہیں پھر گورنمنٹ کالج لاہور میں اقبال ٹی.ڈبلیو.آرنلڈ کے شاگرد ہوئے جو اس سے پہلے ایم.اے.او.کالج علی گڑھ میں سات سال تک فلسفے کے اُستاد رہ چکے تھے۔ اقبال ہمیشہ اُن کی شاگردی پر فخر کرتے اور وہ بھی اقبال کو اپنا مایۂ ناز شاگرد سمجھتے تھے۔ دورانِ طالب علمی اقبال، سرسید کی تحریروں کو توجہ سے پڑھتے اور اُن پر غور و فکر کرتے۔ عقیدت و محبت کا پہلا بھرپور اظہار اُس وقت صفحۂ قرطاس پر منتقل ہوتا ہے، جب ۱۸۹۸ء میں اُنھیں سرسید کے انتقال کی اطلاع ملتی ہے۔ پروفیسر اصغر عباس ''سرسید، اقبال اور علی گڑھ'' میں رقم طراز ہیں:

''۲۷/مارچ ۱۸۹۸ء کو جب سرسید نے

رحلت فرمائی تو سید میر حسن کی ایماء سے اقبال نے تاریخ وفات نکالی اور سورۂ آل عمران کے اس جز سے مادہ تاریخ نکالا جس میں حضرت عیسیٰؑ کے رب العالمین کی خوشنودی کا اظہار فرمایا گیا ہے اور جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وہی موت دینے والا ہے، وہی درجات بلند کرنے والا ہے اور وہی الزام اور بہتان تراشیوں سے پاک کرنے والا ہے''۔ فقیر سید وحیدالدین نے لکھا کہ ''ڈاکٹر اقبال نے اس آیت سے تاریخ وفات نکال کر سرسید کی شخصیت کا بڑا حسین اعتراف کیا ہے''۔

(سرسید، اقبال اور علی گڑھ، ۷۲)

اِسے اتفاق کہیں یا قدرت کا کھیل کہ جس سال سرسید کی ایما پر لارڈ لٹن وائسرائے نے علی گڑھ میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا سنگ بنیاد رکھا، اُسی سال اقبال سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ ذہنی نشوونما عاشقانِ سرسید کے زیر سایہ ہوئی۔ سید والا گُہر کی وفات کے وقت اقبالؔ کی عمر اکیس برس کی تھی۔ وہ فلسفہ میں ایم اے کر رہے تھے، روشن خیال اور صاحب حیثیت تھے، اس عرصہ میں سرسید برابر دورے پر بھی رہے، ایسے میں فوری سوال جو ذہن میں اُبھرتا ہے وہ یہ کہ کیا حیات سیدی میں اقبالؔ نے سرسید سے ملاقات کا شرف حاصل کرنے کا کوئی جتن نہیں کیا؟ نظروں سے اوجھل یہ نکتہ تشنگی کا احساس ہی نہیں دلاتا ہے بلکہ تحقیق طلب بھی ہے۔

لندن میں اقبالؔ کے تھیوڈور ماریسن سے روابط پیدا ہوئے۔ جنھوں نے ۱۸۹۹ء سے ۱۹۰۵ء تک ایم.اے.او کالج کی ترقی اور اس کے نظم ونسق کو برقرار رکھنے میں اہم کردار ادا کیا، نیز راس مسعود کی تعلیم وتربیت پر خصوصی توجہ دی۔ بقول حبیب اللہ خاں:

> ''مسعود سے ان کو اتنی محبت ہوگئی تھی جتنی اپنی اولاد سے اور ہر موقع پر ہندوستان اور انگلستان میں ان کا خیال رکھتے تھے''۔(ص:۵۹)

ایمان اور یقین کی دولت سے مالا مال، علامہ اقبال نے اپنے عہد کی ذہنی، فکری اور عملی صلاحیتوں کو فعال کرنے کے لیے جزوی اختلافات سے گُریز کیا اور سرسید کی انساں دوستی اور علم وعمل کے نظریہ کا سہارا لیا۔ وہ سرسید کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''میں تسلیم کرتا ہوں کہ سرسید کے خیالات اور ان خیالات کے ماتحت انھوں نے جو اقدامات کیے وہ تنقید سے بالا تر نہیں، ان میں گفتگو کی گنجائش ہے، لیکن یہ اقدامات ضروری تھے۔ حالات کا تقاضا تھا کہ ایسا کوئی اقدام کیا جاتا جس سے مسلمانوں کی توجہ وقت کے تقاضوں اور مستقبل کی طرف منعطف ہوتی۔ سرسید احمد خاں کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے یہ اقدام کیا''۔ علامہ اقبال مزید فرماتے ہیں کہ: ''یہ اقدام بہرحال ضروری تھا۔ یہی بات ہے جو اُن کے نکتہ چینوں کی سمجھ میں نہیں آئی''۔(سید نذیر نیازی، اقبال کے حضور میں،

ص:۲۴-۲۶)

پیر کی اتباع میں مُرید نے اسلامی فکر کی تشکیلِ نو کے لیے جنبشِ نوکِ قلم کے توسط سے جو طریق کار اختیار کیا وہ عقلی اور سائنسی تھا۔ بقول شکیل احمد:

> ''اقبال نے فلسفیانہ تصورات کو عقیدے سے ہم آہنگ کرنے کے لیے سائنسی نظریہ اور رویے سے مدد لی''۔ (ڈاکٹر علامہ محمد اقبال پر سرسید احمد کے تصورِ مذہب کے اثرات، پروفیسر شکیل احمد، ص:۷۸)

ماضی قریب و بعید سے اخذ و قبول کرتے ہوئے اقبالؔ کا طرزِ بیان اِس لیے اہم ہے کہ اُنھوں نے مُنفرد انداز میں ماضی، حال اور مستقبل کے موضوع پر بات کی ہے وہ اشرف المخلوقات کو ظلم و جبر اور خوف و دہشت سے نجات دلا کر امن و آزادی کے جذبات و احساسات عطا کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے بندۂ مزدور اور سرمایہ دارانہ نظام کو قرآن حکیم کے توسط سے دیکھا۔ اسی لیے اُن کے یہاں ایک ایسے مردِ مومن کا تصور اُبھرتا ہے جو استحصالی قوتوں سے ٹکرانے کا حوصلہ رکھتا ہو، جبر و استبداد کا جواب بہ بانگ دہل دے سکتا ہو۔

پچھلے سو سال کے منظر نامہ کو سامنے رکھیں تو سرسید اور اقبالؔ کی فکری اور عملی جدوجہد سے متعلق تقریباً ہر پہلو پر اردو میں تحقیق و تنقید کا گراں بہا سرمایہ موجود ہے۔ اِس کے باوجود یہ مصلحِ قوم کی عظمت کی بین دلیل ہی تو ہے کہ اُن کے افکار و نظریات اور شخصیت کی مختلف جہتوں پر صاحبانِ قلم اور ماہرین علم و ادب مسلسل غور و فکر کر رہے ہیں بلکہ جدید علوم و فنون کی روشنی میں دونوں کی ہم آہنگیِ فکر و عمل کا بطور خاص مطالعہ کر رہے ہیں۔ ان مطالعات کے نتائج کے طور پر سرسید اور اقبال کے سرمائے میں خوش گوار اور چشم کشا اضافوں کا سلسلہ مستقل جاری ہے۔ جدید ترین علمی، ادبی اور فکری تناظر میں ان مصلحین قوم کے مطالعے کے نہایت مثبت نتائج منظر عام پر آ رہے ہیں۔

علامہ اقبال کی شاعری بنی نوع انسان خصوصاً امتِ مسلمہ کے اتحاد و اتفاق کی تاریخ کے لحاظ سے موثر و منفرد ہے۔ انھوں نے مخصوص تلمیحات، علامات اور استعارات کے سہارے مسلمانوں کو اُن کے اپنے عظیم الشان کارناموں کی یاد دلاتے ہوئے محبت و یگانگت کا درس دیتے ہیں، یہ ملحوظ رکھتے ہوئے کہ فن مجروح نہ ہو سکے۔ مثلاً ۱۹۰۳ء میں ''مخزن'' لاہور میں شائع ہونے والی نظم ''سیّد کی لوحِ تُربت'' انسانیت کی اعلیٰ قدروں کی بھی ضامن ہے۔ چار بند اور چودہ اشعار پر مشتمل نظم میں وہ اپنا پیغام سرسید کی لوحِ مزار کی زبانی ادا کرتے ہیں۔ اِسی لیے یہ نظم ہم آہنگیِ فکر و عمل کی سب سے واضح مثال ہے۔ پیر و مرشد کا انتخاب انھوں نے اِسی لیے کیا ہے کہ وہ مشکل ترین حالات میں قوم و ملت کی فلاح و بہبود کے لیے کوشاں رہے، اُسے خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کے امکانی جتن کرتے رہے۔ شاعرِ مشرق نے نہایت موثر اور مدلل طریقہ سے قوم کو سمجھایا کہ دین کے ساتھ دنیا کی بھی فکر لازم ہے۔ اور پھر دُنیا کے مکر و فریب اور چمک دمک سے بھی متنبہ کرتے ہیں۔ بُغض و نفاق کو چھوڑتے ہوئے اتحاد و اتفاق پر زور دیتے ہیں۔ ہمت اور جرات کی وضاحت کرتے ہیں۔ صبر و استقلال کو فوقیت دیتے ہوئے ذہن و ضمیر کو بیدار کرتے ہیں۔ نظم کی بنیادی خوبی یہ ہے کہ اپنے آئیڈیل کردار یعنی سرسید احمد خاں کے توسط سے سب کچھ کہا گیا ہے۔ لوحِ مزار کی زبانی ادا ہونے والے ڈرامائی مناظر قاری کو غور و فکر پر مجبور کر دیتے ہیں اور وہ اِس کے توسط سے اپنی تاریخ، تہذیب و ثقافت کے مد و جزر کو اشاراتی طور پر محسوس کر لیتا

ہے۔شاعری میں اقبالؔ کا اپنا وطیرہ رہا ہے کہ وہ یقین محکم، عمل پیہم کے لیے کبھی خالد بن ولید اور طارق ابن زیاد کا سہارا لیتے ہیں تو کبھی رومیؔ اور حافظؔ کا۔علی گڑھ تحریک کی روح میں ڈوبی ہوئی اِس ناصحانہ نظم میں اقبالؔ نے عہد جدید کے سب سے بڑے مصلح قوم کا انتخاب اس لیے کیا کہ سرسید نے مختلف زاویوں سے تعلیمی اور اصلاحی جتن کیے۔تاریخ وتہذیب میں ڈوبی ہوئی یہ نظم قوم کو دین اور دنیا سے منسلک کرتے ہوئے مثبت رُجحان کی طرف مائل کرتی ہے۔ اِس کا محرک بُغض وعناد اور نفرت وتعصب سے لوگوں کو دُور رکھنا ہے۔صبر وتحمل سے کام لیتے ہوئے اتحاد واتفاق کو فروغ دینا ہے۔وقت کی رفتار کو سمجھتے ہوئے جدید علوم وفنون سے دلچسپی پیدا کرتے ہوئے خدمتِ خلق کا جذبہ پیدا کرنا ہے۔اپنی فکر اور اپنی زبان کو پاک رکھنے کی منفرد تاکید کہ خلقِ خدا کو تاریکی، غفلت اور پسپائی سے نکالتے ہوئے بلندیوں کی جانب کیسے گامزن کیا جائے، جہاں جدت وندرت کا اشاریہ ہے وہیں غور وفکر کو بیدار کرنے کا موثر وسیلہ بھی بنتا ہے۔

علامہ اقبال کا سرسید تحریک میں ملوث آفاقی پیغام جون ۱۹۰۷ء میں شائع ہونے والی نظم ''طلبائے علی گڑھ کالج کے نام'' میں بھی منعکس ہے۔سات اشعار پر مشتمل، غزل کی ہیئت میں لکھی ہوئی مذکورہ نظم سرسید کے مشن کی عکاس ہے۔(اِس نظم میں بارہ شعر تھے' بانگ درا' میں صرف سات شعر جزوی ترمیم کے ساتھ شائع ہوئے) اِس میں علم وآگہی کو تقویت بخشتے ہوئے باغِ سرسید کے نونہالوں کو جدید تعلیم وتربیت کی طرف راغب کیا گیا ہے۔نظم کے خالق نے ۱۹۰۸ میں یونیورسٹی کے قیام کے لیے چندہ دیا۔اُس کی حمایت میں جلسے منعقد کیے، تقاریر کیں۔سرآغا خاں کی قیادت میں ایم اے او کو مسلم یونیورسٹی کا درجہ دلانے کے لیے ملک گیر تحریک شروع ہوئی۔یہ وفد ۲۴/فروری ۱۹۱۱ء کو لاہور پہنچا جہاں اقبال بھی اس تحریک میں شامل ہوئے۔(عاصم صدیقی وراحت ابرار: کافی ٹیبل بک، ۲۰۱۷ء)

کج کلاہی شان رکھنے والے شاعرِ مشرق، سرسید اور اُن کے اِس ادارے سے بے پناہ محبت وعقیدت رکھتے تھے۔اِس لیے کہ سیدِ والا گُہر کی قوتِ ارادی، تعمیری سوچ اور علم دوستی کے اقبال بے حد قائل تھے۔اِسی سوز وسازِ آرزو کی بنا پر وہ کئی بار علی گڑھ تشریف لائے۔پہلی بار ۹/فروری ۱۹۱۱ء میں، ایم اے او کالج کے اسٹریچی ہال میں انگریزی میں لکچر دیا جس کا اردو ترجمہ مولانا ظفر علی خاں نے کیا۔اِس لکچر میں اقبالؔ نے دنیاوی ترقی کے ساتھ ساتھ اسلامی شعار سے اُنسیت پر زور دیا اور قوم کی ترقی کے اسباب بتائے۔دوسری بار وہ اپریل ۱۹۲۹ء میں تشریف لائے۔۲۴/اپریل ۱۹۲۹ء کو یونین ہال میں طلبہ نے سپاس نامہ پیش کیا، اور لائف ممبر شپ دی گئی۔ تیسری مرتبہ ۱۸/نومبر ۱۹۲۹ء کو صدر شعبۂ فلسفہ پروفیسر ظفر الحسن کی دعوت پر ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' پر خطبات دینے کے لیے علی گڑھ تشریف لائے۔ایک ہفتہ تک قیام رہا۔صاحبزادہ آفتاب احمد خاں اور رشید احمد صدیقی کی عیادت کی۔ اسٹریچی ہال میں وائس چانسلر سر راس مسعود کی موجودگی میں تین خطبے انگریزی میں پیش کیے جن کا اردو ترجمہ سید نذیر نیازی نے کیا۔ چوتھی مرتبہ سالانہ کانووکیشن میں شرکت کے لیے ۱۸/دسمبر ۱۹۳۴ء کو علی گڑھ آئے۔۲۲/دسمبر کو کارگزار وائس چانسلر نواب اسماعیل نے ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری پیش کی اور سرشاہ سلیمان نے کانووکیشن ایڈریس دیا۔علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور علی گڑھ میگزین میں ۱۹۱۱ء سے علامہ اقبال کی تخلیقات شائع ہورہی تھیں۔پروفیسر اصغر عباس نے اپنے مضمون ''سرسید، اقبالؔ اور علی گڑھ'' میں لکھا ہے:

''اقبالؔ علی گڑھ کے اردو فارسی اور فلسفہ

کے شعبوں کے ایک عرصے تک اکسٹرنل ممبر رہے۔ وہ ۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۵ء تک شعبۂ اردو کے ممبر تھے۔ وہ ۱۹۲۴ء، ۱۹۲۵ء، ۱۹۳۲ء اور ۱۹۳۷ء میں شعبۂ فلسفہ کے بورڈ آف اسٹڈیز کے رکن تھے اور ۱۹۳۵ء میں شعبۂ فارسی نے اُنھیں تین سال کے لیے اپنے شعبہ کا ممبر نامزد کیا تھا''۔(ص:۱۱)

۲۱/اپریل ۱۹۳۸ء کو علی الصباح لاہور میں وفات ہوئی۔ اطلاع ملتے ہی علی گڑھ غم والم میں ڈوب گیا جس کے درجنوں شواہد موجود ہیں۔

انھوں نے اپنی شاعری، خطوط اور خطبات میں مختلف زاویوں سے سرسید کے خوابوں کی تعبیریں اِس طرح پیش کی ہیں کہ مسلمان چہار جانب کامیاب وکامران ہوں، اُن کی عزت وتوقیر میں اضافہ ہو۔ دراصل اقبالؔ نے اپنے اظہار کی بھرپور قوت کے توسط سے عالمی سطح پر بیداری اور حریت پسندی کی جو نئی لہر پیدا کی، وہ قابلِ فخر اور قابلِ تقلید ہے۔ بانیِ درس گاہ کے اِس عظیم الشان ادارے نے بھی اِس عاشقِ سید والا گہر کو سرآنکھوں پر بٹھایا ہے۔ علی گڑھ میگزین کے خصوصی نمبر شائع کیے، پروفیسر شپ آفر کی۔ یونیورسٹی کورٹ کی ممبر شپ کے علاوہ مختلف شعبوں میں رُکنیت دی، نصاب میں داخل کیا۔ سپاس نامہ پیش کیا، ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری عطا کی، اور اُن کے نام سے طلبہ کی رہائش کے لیے ایک وسیع ہال تعمیر کروایا۔ غرض کہ اِس چمنِ سرسید میں علامہ اقبال کے نام سے ان گنت چیزیں منسوب ہیں۔ مولوی عبدالحق، راس مسعود، سجاد حیدر یلدرم اور رشید احمد صدیقی کے نام لکھے خطوط اُن کے فکر وفن کو اُجاگر کرنے میں بھی معاون ثابت ہوتے ہیں۔ سرسید کو سید والا گُہر سے مخاطب کرنے والے پہلے شخص علامہ شبلی نعمانی ہیں۔ دوسرے علامہ اقبال ہیں جنھوں نے سرراس مسعود کی بیٹی نادرہ کی پیدائش پر قطع تاریخ کہتے ہوئے عورت کی عظمت کا بھی اعتراف کیا ہے۔

راس مسعود جلیل القدر کو
جو کہ اصل ونسل میں مجدّد ہے
یادگارِ سید والا گُہر
نور چشم سیدِ محمود ہے
راحتِ جان وجگر دختر ملّی
شکرِ خالق منتِ معبود ہے
خانداں میں ایک لڑکی کا وجود
باعثِ برکاتِ لامحدود ہے
کس قدر برجستہ ہے تاریخ بھی
''باسعادت دختر مسعود ہے''

☆☆☆

قلم کاروں سے التماس

☆ برائے کرم مسودہ صاف اور خوش خط لکھیں۔
☆ مقالہ صفحے کی ایک جانب لکھا ہوا ہو۔
☆ سطروں کے درمیان فاصلہ چھوڑیں۔
☆ کمپوز کیے ہوئے مسودہ کا پروف اچھی طرح دیکھ لیں۔
☆ اپنے مضامین اور تخلیقات
"idarasabras@yahoo.in" پر بھیج سکتے ہیں۔

حبیب نثار

مضمون

میرانجی شمس العشاق کا سنہ پیدائش ووصال

اردو ادب کی نشوونما میں صوفیا نے اہم حصہ ادا کیا ہے۔ دکن میں خانوادہ حضرت خواجہ بندہ نوازؒ کی طرح خانوادہ میرانجی شمس العشاق نے بھی اردو ادب کے فروغ نشر واشاعت میں غیر معمولی خدمات انجام دیں ہیں۔ میرانجی شمس العشاق اس خاندان کے دکن میں بنیاد گذار کی حیثیت رکھتے ہیں وہ ایک عظیم صوفی، مبلغ اور شاعر تھے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ آپ کے حالات زندگی کے بارے میں لاعلمی کے ساتھ ساتھ غلط فہمیاں بھی رواج پا گئیں ہیں۔ پروفیسر محمد ہاشم علی اس صورت حال کا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میرانجی شمس العشاق کا شمار بلا شبہ دکن کے ممتاز صوفیوں میں ہوتا ہے لیکن افسوس ہے کہ بے خبری کے کتنے اندھیرے اور ادھوری اور متضاد معلومات کے کتنے دھند لکے ہیں جو اس عظیم شخصیت کی سوانح حیات پر چھائے ہوئے ہیں۔ حد یہ کہ نہ تو وثوق کے ساتھ یہ بتلایا جاسکتا ہے کہ ان کا جنم کہاں ہوا اور نہ ہی یقین کے ساتھ ان کا سنہ ولادت یا سنہ وفات کا تعین کیا جاسکتا ہے۔(۱)

استاد محترم پروفیسر گیان چند جین نے بھی حضرت میرانجی شمس العشاق کے سلسلے میں ایسے ہی خیالات کا بیان کیا ہے۔ اقتباس دیکھئے:

''اردو ادب کی تاریخ میں خواجہ بندہ نواز کے بعد شاہ میراں جی شمس العشاق سب سے بڑے صوفی ودرویش ہیں.....افسوس یہ ہے کہ شمس العشاق جیسی درخشندہ ہستی کے حالات زندگی تاریکی میں ہیں ان کے نسب، تاریخ ولادت وتاریخ وفات سب پر اختلاف رائے ہے۔ دراصل متضاد قدیمی بیانات کی وجہ سے یہ مسائل ایسے لاینحل ہو گئے ہیں کہ قیاس کا سہارا لیے بغیر چارا نہیں . . . . . مسائل یہ ہیں۔(۲)

استاد محترم پروفیسر گیان چند جین نے اپنے مضمون میں جن مسائل کی جانب اشارہ کیا ہے میری تحقیق کے مطابق ان پانچ مسائل کے مستند تاریخی شواہد حسب ذیل ہیں۔

مسائل	شواہد یا جواب
۱) ان کے والد سید تھے یا مغل	سید تھے
۲) وہ مکہ میں پیدا ہوئے یا بیجاپور یا احمد آباد یا احمد نگر یا دہلی	مکہ میں پیدا ہوئے
۳) ان کا سنہ ولادت کیا ہے	۹۲۲ ہجری
۴) وہ بیجاپور کب آئے	۹۶۶ھ بیجاپور تشریف لائے
۵) ان کا سنہ وفات کیا ہے	۹۹۴ھ بحوالہ مرثیہ از جانم

تفصیلی مباحث آیندہ صفحات میں پیش کیے جاتے ہیں۔ ان مسائل پر تحقیق کرنے والوں میں ذیل کے اصحاب ممتاز ہیں۔

مولوی عبدالحق، ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور، ڈاکٹر محمد اکبر الدین صدیقی، ڈاکٹر محمد ہاشم علی، سخاوت مرزا، ڈاکٹر حسینی

شاہد، ڈاکٹر جمال شریف اور ڈاکٹر گیان چند جین حقیقت یہ ہے کہ میرانجی شمس العشاق جیسی درخشندہ ہستی کے حالات زندگی نہ تاریکی میں ہیں اور نہ ان کے نسب، تاریخ ولادت و تاریخ وفات میں اختلاف موجود ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ ہمارے محققین نے سامنے موجود ماخذ کو نظر انداز کرتے ہوئے ثانوی ماخذات پر غور کیا ہے اور قیاسات کا سہارا لیا اس کی شروعات مولوی عبدالحق کے مضمون سے ہوتی ہے۔

مولوی عبدالحق نے رسالہ اردو اورنگ آباد میں ''قدیم اردو ادب بیجاپور کے اولیاء اللہ کا ایک شاعر خاندان'' کے عنوان سے مضمون لکھا جو اپریل ۱۹۲۷ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔ اس مضمون میں مولوی عبدالحق نے میرانجی شمس العشاق کے حالات زندگی کا بیان کرتے ہوئے ان کی ہندوستان میں آمد اور سنہ وفات پر اظہار کیا ہے۔ اقتباس دیکھئے۔

> ''روضتہ الاولیا او رمحبوب ذی المنن تذکرہ اولیائے دکن، دونوں میں یہ لکھا ہے کہ وہ علی عادل شاہ اول کے ابتدائی عہد میں وارد بیجاپور ہوئے لیکن یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا ہے کیوں کہ علی عادل شاہ اول کا عہد سنہ ۹۶۱ھ (کذا ۹۶۵ھ) سے ۸۸۹ھ تک رہا اور حضرت کی وفات سنہ ۹۰۲ھ میں واقع ہوئی۔ یہ سلطنت عادل شاہی کے بانی یوسف عادل شاہ کا زمانہ ہوتا ہے۔''(۳)

آپ کی تاریخ ولادت صحیح طور پر معلوم نہیں لیکن آپ کی وفات سنہ ۹۰۲ھ میں ہوئی۔ تذکرہ اولیا دکن میں ان کی تاریخ وفات ۹۱۰ھ لکھی ہے۔ مگر یہ صحیح نہیں معلوم ہوتی کیوں کہ ''شمس العشاق'' سے ان کی وفات کی تاریخ نکلتی ہے جو ۹۰۲ ہوتی ہے اور یہ مادہ تاریخ شاہ حسین ذوقی کا کہا ہوا ہے.... البتہ مجھے ایک پرانا مرثیہ ملا جو کسی نے حضرت میرانجی کی وفات پر لکھا ہے اس سے ان کی وفات کی تاریخ ۲۵/ شوال سنہ ۹۰۲ معلوم ہوتی ہے۔''(۴)

مولوی عبدالحق نے یہاں دو حقائق (مولوی صاحب کی نقطہ نظر سے) بیان کیے ہیں۔ ایک یہ کہ میرانجی شمس العشاق کا سنہ وفات ۹۰۲ھ ہے کہ شاہ حسین ذوقی نے تاریخ کہی ہے اور کسی نا معلوم مرثیہ نگار کے مرثیہ سے بھی اسی سنہ کا پتہ چلتا ہے (چوں کہ قطعہ تاریخ کی تصدیق مرثیہ سے ہوتی ہے غالباً اسی لیے مولوی عبد الحق نے اس سنہ کو مستند سمجھا ہے) چوں کہ انھوں نے میرانجی کا سنہ وفات ۹۰۲ھ تسلیم کیا ہے اسی تاریخی حقیقت کے تناظر میں انہوں نے یوسف عادل شاہ کے عہد حکومت میں میرانجی شمس العشاق کے ہندوستان تشریف لانے کا بیان کیا ہے۔

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے مولوی عبدالحق کی تحقیق کو رد کیا اور اپنے زیر اشاعت ارشادنامے کے مقدمہ میں اس اختلاف کو واضح کیا ہے۔ لکھتے ہیں

> ''ہمارا خیال ہے کہ ۹۰۲ھ میراں جی کا سنہ وفات نہیں بلکہ سنہ پیدائش ہے اور ان کا سنہ وفات اصل میں سنہ ۹۷۰ھ صحیح ہے جیسا کہ تذکرہ اولیائے دکن میں درج ہے..... تمام تذکرے اس امر کے اظہار اس متفق ہیں کہ شاہ میراں جی بیجاپور کو علی عادل شاہ کے عہد میں تشریف لائے۔ علی عاشل شاہ ۹۶۵ھ میں

تخت نشین ہوا اور ۹۸۸ ھ میں فوت۔ اس طرح شاہ میراں جی کا ورود بیجاپور ۹۶۵ ھ کے بعد ہوا اور انھوں نے یہاں چند ہی سال قیام کیا تھا کہ وفات پائی۔''(۵)

مثنوی ارشاد نامہ کے مقدمہ میں ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور اس موضوع کے مختلف نکات پر بحث کرنے کے بعد آخر میں لکھتے ہیں۔

''غرض شاہ میراں جی کی تاریخ وفات ۹۰۲ کی جگہ ۹۷۰ ھ ہی ماننی پڑے گی اور لقب شمس العشاق مادہ تاریخ پیدائش ہونے کی وجہ سے ان کی زندگی ہی میں مشہور ہوا ہوگا۔ جس کو شاہ حسین ذوقی اور ان کی تقلید میں مولوی عبدالحق صاحب نے تاریخ وفات سمجھ لیا''۔(۶)

مولوی عبدالحق نے شاہ حسین ذوقی کی تاریخ کی سند پر شاہ میراں جی کا سنہ وفات ۹۰۲ قرار دیا تھا۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے تذکرہ اولیاء دکن میں دیئے گئے میراں جی کے سنہ وفات کو صحیح تسلیم کیا کہ تذکروں میں میراں جی کے ہندوستان آنے کا سنہ ۹۶۵ ھ کے بعد لکھا ہے اور مولوی عبدالحق کے بیان کردہ سنہ وفات ۹۰۲ کو ڈاکٹر زور نے شاہ حسین ذوقی کی کہی ہوئی تاریخ کے پس منظر میں میراں جی کا سنہ پیدائش قرار دیا ہے۔

۱۹۶۱ء کے بعد میراں جی پر لکھا گیا مرثیہ موضوع بحث بن جاتا ہے اور اس میں مرثیہ نگار کی بیان کی گئی تاریخیں ہمارے محققین کی ''مشق سخن'' کی وجہ بن جاتی ہیں۔ ڈاکٹر محمد اکبرالدین صدیقی نے ۱۹۶۱ء میں برہان الدین جانم کی ''کلمتہ الحقائق'' شائع کی اس کے مقدمہ میں یہ انکشاف کیا کہ مولوی عبدالحق نے میراں جی پر لکھے ہوے جس مرثیہ کا تذکرہ کیا ہے وہ شاہ میراں جی شمس العشاق ہی پر لکھا گیا ہے اور لکھنے والے ہیں میراں جی کے صاحبزادہ حضرت برہان الدین جانم، ڈاکٹر اکبرالدین صدیقی نے اس مرثیہ کی سند پر حضرت میراں جی شمس العشاق کی تاریخ وفات ۲۵ رشوال ۹۰۲ ھ قرار دیا۔''(۷)

اقتباس دیکھئے۔

''یہ مرثیہ حضرت میراں جی شمس العشاق کی عالمانہ فضیلت و بزرگی اور صوفیانہ زندگی کا آئینہ ہے اور بیٹے نے باپ کے غم میں اپنی آنکھوں سے جو گنگا جمنا بہاے ہیں وہ آج بھی اسی طرح ہمارے سامنے ہیں۔''(۸)

محمد اکبرالدین صدیقی نے برہان الدین جانم کے مرثیہ ''تاریخ ومقام'' کے تحت حسب ذیل چار شعر لکھے ہیں۔

''تاریخ حضرت سال نوسو دو اس پر اگلے بھی دو

دن مدت وفا شو جے کچ حکم الٰہی کا اربع سوں یو سال ہے ما ہے کوں شوال ہے رحلت کیے اس حال ہے جے کچ حکم الٰہی کا تاریخ بست و پنج بو دبسیار گریاں رنج شد در حال واصل گنج خود جے کچ حکم الٰہی کا شب پنجشنبہ روشن کیا ہجرت منور پور کیا جیوڑا قبض کران لیا جے کچ حکم الٰہی کا۔(۹)

تعجب اس بات پر ہے کہ ان اشعار کو درج کرنے کے بعد محمد اکبرالدین صدیقی نے ان اشعار پر کوئی اظہار خیال نہیں کیا ہے خصوصاً یہاں درج کیے گئے اشعار میں پہلا اور تیسرا مصرع قابل توجہ ہے۔ اسی مصرع کو مولوی عبدالحق نے اس طرح لکھا ہے تاریخ حضرت سال نوسو، اس پر اگلے بھی دو۔

محمد ہاشم علی نے ۱۹۶۲ء میں مغز مرغوب اور چہار

شہادت، میراں جی شمس العشاق کے دور سالے بازیافت کیے اس کے مقدمہ میں میراں جی کے سنہ پیدائش و وفات پر روشنی ڈالی ہے۔انھیں کتب خانہ گجی محل میں اس مرثیہ کے پانچ شعر دستیاب ہوے جن کے مطالعہ کے بعد مندرجہ بالا دو مصرعوں کی قرأت انہوں نے اس طرح کی ہے۔

تاریخ حضرت سال نوسو دو، اس پر اگلے بھی دو (۱۰)

اربع تسوں یو سال ہے ماہ کوں شوال ہے۔(۱۱)

محمد ہاشم علی نے دوسرے مصرعے کے دوسرے لفظ کو ''تسعون'' قرار دیا جس سے مصرع کی معنویت مکمل ہوتی ہے کہ ''اربع تسعوں' سے ۹۴ (چورانوے) سال مراد ہے۔محمد ہاشم علی نے لکھا ہے کہ ''وفات کے وقت حضرت کی عمر ۹۴ سال تھی''۔

ڈاکٹر محمد ہاشم علی نے اپنی تحقیق سے میراں جی شمس العشاق کی تاریخ پیدائش اور وفات کے سلسلے میں دو نکات کا اضافہ کیا کہ مرثیہ میں ۹۰۴ھ کا ذکر ہے اور میراں جی شمس العشاق کی عمر ۹۴ سال تھی۔

مولوی سخاوت مرزا نے اپنے مضمون ''حضرت میراں جی شمس العشاق کی تاریخ وصال'' میں حضرت میراں جی شمس العشاق کے ورود بیجاپور کا سنہ بسا تین سلاطین کے حوالے سے ۹۶۶ھ اور بناء شاہ پور ۹۶۷ھ لکھا ہے اور ڈاکٹر سید محی الدین قادری نے میراں جی کی جو تاریخ وصال ۹۷۰ لکھی ہے اسی کو تسلیم کیا ہے۔(۱۱)

ڈاکٹر حسینی شاہد نے اپنی تصنیف ''سید شاہ امین الدین علی اعلیٰ حیات اور کارنامے میں میراں جی شمس العشاق پر لکھے گئے مرثیہ کے حوالے سے سنہ وفات ''نوسو دو اس پر اگلے بھی دو'' کی بنا پر ۹۲۲ھ قرار دیا ہے۔(۱۳)

ڈاکٹر جمال شریف اپنی تصنیف ''دکن میں اردو شاعری ولی سے پہلے'' میں حضرت میراں جی شمس العشاق کی تاریخ وصال ڈاکٹر زور سے اتفاق کرتے ہوئے ۹۷۰ھ تسلیم کرتے ہیں۔اور ۹۰۲ھ کو تاریخ بیعت قرار دیتے ہیں۔(۱۴)

پروفیسر گیان چند جین میراں جی شمس العشاق کی تاریخ پیدائش ۹۰۲ یا ۹۰۴ھ تسلیم کرتے ہیں اور ڈاکٹر حسینی شاہد کی بیان کردہ تاریخ وفات ۹۲۲ کو تسلیم نہیں کرتے ہیں اور'' نوسو دو اس پر اگلے بھی دو' سے وہ ۹۰۲۲ بتاتے ہیں۔(۱۵)

یہاں استاد محترم پروفیسر گیان چند جین نے ڈاکٹر حسینی شاہد کے ساتھ زیادتی کی ہے دراصل دکن میں تاریخ چاہے نثر میں لکھی جا رہی ہو کہ منظوم تعداد کے ساتھ ''پر'' لکھنے کا رواج تھا یہ دراوڈی زبانوں کی دین ہے تلگو اور کنڑ میں یہی طریقہ رائج ہے کہ پہلے سیکڑا کی تعداد پھر دہائی اور پھر اکائی کی تعداد لکھی جاتی ہے حضرت برہان الدین جانم نے اسی گنتی figure کو الفاظ میں لکھ دیا ہے اور ان کی مراد سیدھے سیدھے نوسو بائیس ہی ہے جیسا کہ حسینی شاہد نے اخذ کیا ہے یہاں مثلاً چند تاریخیں درج کی جاتی ہیں۔

ہجرت تھے دس سو سال ہے چالیس پر بھی پانچ تھے
تب یو مرتب سب ہوا تحفہ سود کھتی نامور' تحفۃ النصائح ۱۰۴۵ھ

سنہ یک ہزار ہور ستر یو سات
لکھیا تھا اوسی سال یو نکات۔۱۰۷۷ احکام الصلوٰۃ مخطوطہ ۳۴۹۲ فقہ حنفی، آصفیہ

اگیارا سو پہ تھا سن ساٹ ہور سات
کہ بھی رمضان کی تھی گیارھویں رات، ۱۱۶۷ھ ترجمہ سراج المومنین، مخطوطہ نمبر ۱۱۶

ہزار و دو صد اوس پہ چالیس و چار
جب ہجری سے گزرے لکھا یہ بچار، ۱۲۴۴ھ رسالہ بدعت شکن، مخطوطہ نمبر ۲۴۳، آصفیہ

گیان چند جین نے ۹۰۲ ہی تسلیم کیا ہے اور ایسے

میراں جی شمس العشاق کی تاریخ پیدائش قرار دیا ہے۔ محمد ہاشم علی نے ''اربع تسعون'' تجویز کرنے کے بعد اسے حضرت میراں جی کی عمر قرار دیا ہے میراں جی کی اس عمر کی گیان چند جین باوجود اختلاف رکھنے کے تسلیم کرتے ہیں۔ اسی لیے برہان الدین جانم کے مرثیہ کا زمانہ تخلیق ۹۹۶ ھ قرار دیتے ہیں۔ ۹۰۲+ ۹۴=۹۹۶ اور یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ حضرت میراں جی شمس العشاق کا سنہ وصال ۹۹۴ ھ ہے۔(۱۶)

راقم الحروف نے اس مضمون کی ابتدا میں لکھا ہے کہ میراں جی شمس العشاق کے حالات زندگی کے بنیادی ماخذ موجود ہیں لیکن ہمارے محققین نے ثانوی ماخذات کو ترجیح دی اور قیاس سے کام لے کر ایک سیدھی سادی حقیقت کو پیچیدہ مسئلہ بنا دیا ہے۔ میراں جی شمس العشاق کا نام ''ولدیت'' تاریخ پیدائش مقام پیدائش اور تاریخ وصال کے سلسلے میں خودنوشت، بساتین السلاطین، اور مرثیہ بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

خودنوشت نسب نامہ کا مخطوطہ کتب خانہ ادارۂ ادبیات اردو میں موجود ہے جو صرف دو صفحات پر مشتمل ہے یہ فارسی میں ہے۔ ڈاکٹر حسینی شاہد نے اپنی تصنیف ''سید شاہ امین الدین علی اعلیٰ'' میں خودنوشت نقل کرنے کے بعد ان سے جو اہم معلومات حاصل ہوتی ہیں انھیں گیارہ نکات کے طور پر درج کیا ہے۔ ان میں سے چھ نکات ہمارے موضوع سے متعلق ہیں جن سے میراں جی شمس العشاق کا نام، ولدیت، وطن اور مقام پیدائش کا علم ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

۱) میراں جی سادات زیدی سے تھے

۲) ان کا نام امیر الدین اور عرف میراں جی تھا

۳) ان کے والد کا نام حاجی شریف دوام الدین تھا اور وہ مکی تھے

۴) حاجی شریف دوام الدین شادی کی غرض سے ہندوستان آئے اور چغتائی خاندان میں بیاہ کر کے وطن لوٹ گئے۔

۵) ان کا آبائی مکان ابوبکر بن قحافہ کے گھر کے برابر محلّہ قریشہ میں واقع تھا۔

۶) میراں جی اپنے آبائی مکان میں پیدا ہوئے (۱۷)

(حسینی شاہد نے عین خودنوشت کے مطابق یہ نکات لکھے ہیں جو کہ فارسی میں ہے اور کتب خانہ ادارۂ ادبیات اردو، مخطوطہ ۸۶۲ میں دیکھا جا سکتا ہے)

میراں جی شمس العشاق کے نام، عرفیت، ولادت، مقام پیدائش اور وطن کے سلسلے میں یہ ایک اہم سند اور ماخذ ہے جیسے ہمارے محققین نے نظر انداز کرتے ہوئے بیسویں صدی کے تذکروں اور محققین کی آرا پر صاد کیا ہے جس کی وجہ سے آپ کے سلسلے میں غلط فہمیاں راہ پا گئی ہیں۔

مولوی عبد الحق نے میراں جی شمس العشاق کا سنہ وصال ۹۰۲ قرار دیا ہے دلیل یہ دی ہے کہ شمس العشاق سے یہ سنہ برآمد ہوتا ہے اور دکنی کے ایک شاعر شاہ حسین ذوقی نے یہ تاریخ نکالی ہے جب کہ بساتین السلاطین میں علی عادل شاہ اول کے عہد کے اہم واقعات میں میراں جی شمس العشاق کی بیجاپور آمد اور شاہ پور میں سکونت اختیار کرنے کا تذکرہ موجود ہے۔(۹۶۶ ھ میں) بساتین السلاطین ایک اہم تاریخی کتاب ہے اور ہم اس ماخذ کو نظر انداز نہیں کر سکتے مزید براں میراں جی شمس العشاق نے اپنی خود نوشت میں عہد علی عادل شاہ اول میں بیجاپور آنے کا ذکر کیا ہے۔

خودنوشت اور بساتین السلاطین کی سند سے پتہ چلتا ہے کہ ۹۶۶ ھ کے بعد میراں جی شمس العشاق ہندوستان آئے ہیں اس حقیقت کی موجودگی میں ہونا یہ چاہیے تھا کہ مولوی عبد الحق کی بیان کردہ تاریخ وفات ۹۰۲ ھ کہ یکسر نظر انداز کر دیا جاتا لیکن ہمارے محققین نے حقیقت پر قیاس کو ترجیح دی ہے۔

اگر ۹۶۶ھ کے بعد میراں جی شمس العشاق ہندوستان آئے ہیں اور اسی کے بعد مرشد کے حکم پر انہوں نے بھنگار (گجرات) جا کر شادی کی ہے ور ۹۷۲ھ میں انہیں پہلی اولاد سے اللہ نے نوازا جنھیں ہم برہان الدین جانم کے نام سے جانتے ہیں۔ تو اس صورت میں ۹۰۲ھ میں وفات کا مفروضہ خود بخود رد ہو جاتا ہے۔

اب مسئلہ رہ جاتا ہے میراں جی کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات کا اس سلسلے میں حضرت برہان الدین جانم کا کہا ہوا مرثیہ ہماری دستگیری کے لیے موجود ہے۔ حضرت جانم نے اپنے مرثیہ میں میراں جی کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات لکھی ہے۔ اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ یہ مرتبہ حضرت برہان الدین جانم کی تخلیق ہے اور اس کا قدیم ترین نسخہ ۱۰۶۸ھ کا ملتا ہے۔ متعلقہ دو شعر حسب ذیل ہیں۔

تاریخ حضرت سال نو سو دو اس پر اگلے بھی دو
ویں مدت وفات یو سنو جے کچ حکم الٰہی کا
اربع تسعون یو سال ہے ما ہے کوں شوال ہے
رحلت کیے اس حال ہے جسے کچ حکم الٰہی کا

گیان چند جین پہلے مصرع کے بارے میں لکھتے ہیں ''تاریخ حضرت سال نو سو دو اس پر اگلے بھی دو'' سے مراد تاریخ ولادت حضرت ہے۔'' (۱۸) گیان چند جین نے ''نو سو دو اس پر اگلے بھی دو'' میں ۹۰۲ اور ۹۰۴ھ دونوں مراد لیا ہے۔ ڈاکٹر زورؔ، ڈاکٹر محمد ہاشم علی اور ڈاکٹر اکبر الدین صدیقی نے اس سے ۹۰۴ھ اخذ کیا ہے البتہ ڈاکٹر حسینی شاہد نے اس سے ۹۲۲ھ برآمد ہونے کی تصدیق کی ہے۔ یہ تاریخ حقیقتاً ۹۲۲ھ ہی ہے جیسا کہ پچھلے صفحات میں راقم وضاحت کی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت میراں جی کی تاریخ پیدائش ۹۲۲ھ ہے۔ اس کو سچ تسلیم کرنے کا جواز بھی ہے۔ بساتین سلاطین میں لکھا ہے کہ میراں جی ۹۶۶ھ میں بیجاپور تشریف لائے ہیں۔ خود نوشت میں لکھا ہے کہ ''وبعد از بیست و دو سال یک طرف حال پیدا شد'' یعنی ۲۲ برس بعد ان پر ایک کیفیت پیدا ہوئی، یہ کیفیت کتنے عرصہ تک رہی معلوم نہیں، ہمارے محققین نے اس تحریر سے ۲۲ واں برس مراد لیا ہے لیکن راقم کا خیال ہے کہ ''بعد از بیست ودو'' سے ۲۲ ویں برسی کے بعد ایک کیفیت کے طاری ہونے کا ذکر ہے ہم اس کیفیت کی مدت دس برس مراد لیتے ہیں اور اب حضرت میراں جی شمس العشاق کی عمر کا حاصل یوں گا۔
۹۲۲+۲۲+۱۰=۹۵۴ھ اس کیفیت طاری ہونے کے بعد آپ بارہ برس تک مدینہ منورہ میں متمکن رہے یعنی ۹۵۴+۱۲=۹۶۶ھ اور یہ وہ تاریخ ہے جس کا ذکر بساتین السلاطین میں ملتا ہے۔ اس حساب سے ہمیں میراں جی شمس العشاق کی تاریخ پیدائش ۹۲۲ھ تسلیم کرنا ہوگا جسے خود ان کے فرزند اور خلیفہ حضرت برہان الدین جانم نے بیان کیا ہے۔

میراں جی شمس العشاق کی تارخ وفات کا تعین استاد محترم پروفیسر گیان چند جین نے کیا ہے جو برہان الدین جانم کے مرثیہ میں دی ہوئی تاریخ ہے کہ ۹۹۴ھ شوال کی ۲۵ تاریخ اور شب پنج شنبہ کو آپ کا وصال ہوا۔ یعنی میراں جی شمس العشاق کی تاریخ پیدائش ۹۲۲ھ اور تاریخ وصال ۹۹۴ھ ہے۔ یعنی

ع تاریخ حضرت سال نو سو دو اس پر اگلے بھی دو = ۹۲۲ھ
ع اربع تسعون یو سال ہے ما ہے کوں شوال ہے = ۹۹۴ھ

☆☆☆

حوالے:

۱) پروفیسر محمد ہاشم علی ''اردو شاری، عادل شاہی دور میں''، مضمون مشمولہ تاریخ ادب اردو کرناٹک، مرتب و ناشر کرناٹک اردو اکیڈیمی، ۱۹۹۴ء، ص ۲۰۰

۲) پروفیسر گیان چند جین ''اردو نثر ۱۶۰۰ تک'' باب ششم مشمولہ تاریخ ادب اردو جلد دوم، ص ۳۲۶

۳،۴) مولوی عبدالحق ''قدیم اردو ادب بیجاپور کے اولیا اللہ کا ایک شاعر خاندان''، مضمون مطبوعہ رسالہ اردو، اورنگ آباد، اپریل ۱۹۲۷ء، ص ۱۷۲

۵) ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ''ارشادنامہ'' مقدمہ مخزونہ کتب خانہ ادارۂ ادبیات اردو، ص ۲۰

۶) ایضاً ص ۲۵

۷) ڈاکٹر محمد اکبرالدین صدیقی ''کلمتہ الحقائق'' مقدمہ جولائی ۱۹۶۱ء ص ۴

۸) ایضاً ص ۶

۹) ایضاً، ص ۵

۱۰) محمد ہاشم علی ''مغز مرغوب و چہار شہادت، مقدمہ ۱۹۶۲ء ص ۲۸

۱۱) ایضاً ص ۱۵ محمد ہاشم علی ''اردو شاعری، عادل شاہی دور میں''، ص ۲۰۱

۱۲) مولوی سخاوت مرزا، حضرت میراں جی شمس العشاق کی تاریخ و وصال''، مضمون مطبوعہ رسالہ اردو نامہ، کراچی، جنوری ۱۹۶۸ھ، ص ۴۰ و ۴۱

۱۳) ڈاکٹر حسینی شاہد، ''سید شاہ امین الدین علی اعلیٰ حیات اور کارنامے''، ۱۹۷۳ء، ص ۹۷

۱۴) ڈاکٹر محمد جمال شریف ''دکن میں اردو شاعری ولی سے پہلے'' ۲۰۰۴، ص ۱۴۱

۱۵) پروفیسر گیان چند جین، تاریخ ادب اردو جلد دوم، ص ۳۴۳

۱۶) ایضاً، ص ۳۴۷، ۳۴۹

۱۷) ڈاکٹر حسینی شاہد ''سید شاہ امین الدین علی اعلیٰ حیات اور کارنامے''، ص ۷۵

۱۸) پروفیسر گیان چند جین ایضاً، ص ۳۴۷

.....

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

کے نامور شخصیات پر لکھے گئے مضامین کا مجموعہ

افاداتِ زور

(جلد چہارم)

مرتب

سید رفیع الدین قادری

ملنے کا پتہ:

زور فاؤنڈیشن، زور کامپلکس، پنجہ گٹہ حیدرآباد

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی۔۶

ایوانِ اردو، پنجہ گٹہ روڈ، سوماجی گوڑہ، حیدرآباد۔۸۲

عبد الحئی

مضمون

فکر تونسوی: شخصیت اور طنز و مزاح نگاری

خوش طبعی اور مزاح ہماری زندگی کا ایک اہم حصہ ہے۔ آج جس طرح کے مسائل سے پوری دنیا دوچار ہے اور لوگ خود اپنے لیے بھی مشکل سے وقت نکال پاتے ہیں۔ ذہنی تناؤ اور کام کا بوجھ انسان کو وقت سے قبل ناتواں بنا دیتا ہے۔ اس صورت حال میں ہنسی کا کوئی موقع، کچھ ظریفانہ جملے اور مضحکہ خیز باتیں تھوڑی دیر کے لیے ہمیں خوشی اور دلبستگی کا سامان فراہم کر دیتی ہیں۔ زمانہ قدیم میں سنتے آئے ہیں کہ ہنسنے سے خون بڑھتا ہے اور ہنسی کا کوئی موقع نہیں جانے دینا چاہیے۔ اسی ضرورت کو محسوس کر کے ہمارے ادیبوں نے طنز و مزاح اور ظرافت کی بنیاد ڈالی۔ ان طنزیہ و مزاحیہ ادیبوں کی تحریریں پڑھ لیں اور لگاتار پڑھتے رہیں تو آپ کو پارک میں جا کر گروپ بنا کے ہنسنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ مزاح یا مذاق اور دل بستگی ایک ایسی پرلطف کیفیت ہے، ایک ایسا خوش نما احساس ہے جس میں کچھ دیر کے لئے انسان کو ذہنی خوشی ملتی ہے، یہ ایسا جذبہ ہے جو تقریباً سبھی انسانوں میں ہوتا ہے۔ مسرت اور شادمانی کے لمحوں میں انسان اس جذبے کا اس احساس کا بھرپور مظاہرہ کرتا ہے اور یقیناً یہ خدا کی جانب سے انسانوں کو ودیعت کردہ ایک عظیم تحفہ ہے۔ دلوں کی پژمردگی، اداسی، تناؤ اور غم و اندوہ کو بھول کر تھوڑی تفریح حاصل کرنے کا بہترین نسخہ ہے۔

وزیر آغا اپنی تصنیف اردو ادب میں طنز و مزاح میں اسی جانب اشارہ کرتے ہیں۔

> ہنسی نہ صرف افراد کو باہم مربوط ہونے کی ترغیب دیتی ہے بلکہ ہر اس فرد کو نشانۂ تمسخر بھی بناتی ہے جو سوسائٹی کے مروجہ قواعد و ضوابط سے انحراف کرتا ہے۔ چنانچہ مزاحیہ کردار صرف اس لیے مزاحیہ رنگ میں نظر آتا ہے کہ اس سے بعض ایسی حماقتیں سرزد ہوتی ہیں جن سے سوسائٹی کے دوسرے افراد محظوظ ہوتے ہیں۔ ص۔30

طنز و مزاح کی شروعات اردو زبان کے آغاز کے ساتھ ہی ہوتی ہے۔ ولی دکنی اور جعفر زٹلی کے کلام میں مزاح نظر آجاتا ہے۔ جعفر زٹلی کے یہاں مزاح نے فحش گوئی کی صورت اختیار کر لی تھی لیکن ان کی شاعری میں طنز اس قدر بھرا ہوا ہے کہ اس میں نشتریت اور زہرناکی کے عناصر شامل ہیں۔ شمالی ہندوستان میں شاکر ناجی اور سودا سے اس کی شروعات ہوتی ہے۔ انشاء، رنگین سے ہوتے ہوئے طنز و مزاح نظیر اور اکبر الہ آبادی تک پہنچتا ہے۔ نظیر اور اکبر الہ آبادی نے عوامی روایتوں، رسوموں اور مغربیت پر بھرپور طنز کیا ہے۔ غالب کے خطوط طنز و مزاح کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ انھوں نے اپنی ذات کو نشانہ بناتے ہوئے مزاح و ظرافت کی ایک زبردست مثال قائم کی۔ مکتوبات کے علاوہ ان کی شاعری میں بھی طنز و مزاح کے عناصر موجود ہیں۔ اودھ پنچ اور منشی سجاد حسین نے ظرافت نگاری کو نیا مقام عطا کیا۔ بعد میں فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، خواجہ حسن نظامی، شوکت تھانوی، کنہیا لال کپور اور ظفر علی خاں نے طنز و مزاح کو مزید استحکام دیا اور اردو ادب میں اسے باقاعدہ ایک صنف کے طور پر قبول کر لیا گیا۔

برصغیر کی تقسیم کے بعد پاکستان میں شفیق الرحمٰن، مشتاق احمد یوسفی، کرنل محمد خاں، ابن انشاء وغیرہ اور ہندوستان میں فرحت کاکوروی، فکر تونسوی، کوثر چاندپوری، دلیپ سنگھ، وجاہت علی سندیلوی، مجتبیٰ حسین، یوسف ناظم، پرویز یداللہ مہدی، احمد جمال

پاشا، کنھیالال کپور، خواجہ عبدالغفور، شفیقہ فرحت اور نصرت ظہیر کے نام قابل ذکر ہیں۔ اسی طرح شاعری میں رضا نقوی واہی، سلیمان خطیب، دلاور فگار، شوکت تھانوی، ہلال رضوی، ماچس لکھنوی، شہباز امروہوی، ساغر خیامی اور پاپولر میرٹھی وغیرہ نے مزاحیہ شاعری کو مزید استحکام بخشا۔ طنز و مزاح کے زمرے میں پیروڈی، تحریف، رمز، ہجو، ہزل، لطیفہ اور ظرافت کو رکھا جا سکتا ہے۔ مزاح اور دل بستگی انسانی فطرت کا ایک لازمی جز ہے۔ کوئی بھی انسان جو ان سے محظوظ نہیں ہوتا اسے مغرور، متکبر، بدمزاج جیسے القابات سے نوازا جاتا ہے جب کہ ہمیشہ خوش رہنے والے اور ہنسنے مسکرانے والے کو خوش خلق اور خوش مزاج کہتے ہیں۔

آزادی سے قبل جب ترقی پسندی کا دور دورہ تھا۔ اُس وقت کے تقریباً تمام قلم کاروں کی تحریروں میں طنز و مزاح کا عنصر صاف دکھائی دے جاتا ہے۔ سعادت حسن منٹو، عصمت، بیدی اور کرشن چندر کے علاوہ دوسرے ادیب و افسانہ نگار بھی طنز و مزاح سے بھری تحریروں میں طبع آزمائی کر رہے تھے۔ بعد میں آزادی کی لڑائی کے تیز ہونے کے بعد ادیبوں کو مزید موضوعات مل گئے۔ فرقہ وارانہ فسادات، انگریز حکومت کا ظلم اور دیگر معاشی، سیاسی اور سماجی مسائل کو قلمکاروں نے اپنا موضوع بنایا۔ آزادی کے بعد ایک جانب تو لوگوں میں خوشی کا احساس تھا تو دوسری جانب صف ماتم بچھی تھی۔ اس تقسیم نے لاکھوں انسانوں کو موت کی نیند سلا دیا اور کتنے ہی افراد بے گھر ہو گئے۔ لاکھوں انسانوں کو نقل مکانی کرنی پڑی اور اپنی مٹی، اپنا وطن چھوڑ دینا پڑا۔ اس دور کے ادب اور مختلف تحریروں میں عجیب سی بے حسی در آئی تھی۔ لوگ ایک طرح سے اپنی زندگی سے اکتا گئے تھے اور راہ فرار تلاش کر رہے تھے۔ ایسے وقت میں ایک ایسا طنز و مزاح نگار اردو ادب میں وارد ہوتا ہے جس نے خود بھی تقسیم کا درد جھیلا تھا اور اسے بھی پاکستان سے ہندوستان نقل مکانی کرنی پڑی تھی۔ اس طنز و مزاح نگار کا نام رام لال بھاٹیہ ہے جو اردو ادب میں فکر تونسوی کے نام سے مشہور ہوئے۔

اردو نثر میں طنزیہ و مزاحیہ کالم نگاری کا الگ مقام ہے۔ اردو صحافت کے آغاز سے ہی کالم نگاری کا بھی آغاز ہوتا ہے۔ اردو اخبارات میں کالم نگار معاشرے کے مختلف پہلوؤں پر اظہارِ خیال کرتے رہے ہیں۔ سماج میں پھیلی فرسودہ روایات اور دیگر مسائل کو کالم نگاری کا موضوع بنایا جاتا رہا ہے۔ آغاز میں سنجیدہ کالم گاری ہوتی تھی لیکن 1877 میں اودھ پنچ کے اجرا کے بعد طنزیہ و مزاحیہ کالم نگاری کی شروعات ہوئی۔ 'اودھ پنچ' کے بعد زمیندار، پیسہ اخبار، گلدستہ ریاض، فتنہ، پرتاپ، ملاپ، انقلاب، وغیرہ اخبارات کے مزاحیہ کالم بہت مشہور ہوئے۔ اردو کے ادبی رسالوں نے بھی اِس روش کو اپنایا اور طنزیہ و مزاحیہ کالم لکھے جانے لگے۔ ماہنامہ بیسویں صدی کے 'تیر و نشتر' کو آج بھی لوگ نہیں بھولے ہیں۔ طنزیہ و مزاحیہ کالموں کے موضوعات میں بھی کافی تنوع دیکھنے کو ملتا ہے۔ آزادی سے قبل انگریزوں کی پالیسیوں، حکمت عملی اور ظلم و زیادتی کو خوب نمک مرچ لگا کر پیش کیا جاتا تھا جبکہ آزادی کے بعد موضوعات تبدیل ہو گئے۔ تقسیم ہند، غریبی، ذات پات، تعلیم و تربیت جیسے موضوعات طنزیہ و مزاحیہ کالم نگاری میں در آئے۔

فکر تونسوی آزادی کے بعد کے طنزیہ و مزاحیہ کالم نگاروں میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے ملک کے مختلف مسائل کو اپنے کالموں کا حصہ بنایا۔ انھوں نے 1952 میں 'نیا زمانہ' اخبار میں آج کی خبر کے نام سے کالم لکھنے کا آغاز کیا۔ کچھ برسوں بعد وہ روزنامہ 'ملاپ' دہلی سے وابستہ ہو گئے اور ان کا مشہور زمانہ کالم 'پیاز کے چھلکے' چھپنے لگا جو 1956 سے 1987 تک باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا۔ نامی انصاری لکھتے ہیں:

> ''اردو اخبار 'ملاپ' میں برسوں فکر تونسوی نے پیاز کے چھلکے کے عنوان سے طنزیہ کالم لکھے۔

وہ روزمرہ کی سیاسی وسماجی زندگی کے واقعات کو موضوعِ سخن بناتے رہے۔ چونکہ ان کے پاس زندگی کے عملی تجربات اور مشاہدات کی کمی نہ تھی اس لیے ان کی روزانہ کالم نویسی میں بھی ایک خاص توانائی اور قوت ہوتی ہے۔ ان کے قاری کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ خاص اسی کے تجربے کی بات کر رہے ہوں۔ فکر تونسوی، انسان کو اس کی ساری خوبیوں اور خرابیوں کے ساتھ برتتے اور دیکھتے ہیں۔ ان کے پاس نہ تو رنگین شیشوں کی عینک تھی اور نہ بلندی کا مصنوعی زینہ۔ وہ آدمیوں میں گھل مل کر ان کے دکھ درد کا ادراک کرتے تھے اور اِس کو طنز و مزاح کی چاشنی میں ڈبو کر اخبار کے صفحے پر پھیلا دیتے تھے۔'' (نامی انصاری آزادی کے بعد اردو نثر میں طنز و مزاح، ص166)

فکر تونسوی عام بول چال کے الفاظ اور اصطلاحات سے طنز و مزاح پیدا کرنے میں ماہر تھے۔ روزمرہ کے دنوں میں پیش آنے والے واقعات ان کے موضوع ہوتے تھے۔ رشوت، غربت، تعلیم و تربیت جیسے موضوعات پر انھوں نے بہت سارے مضامین لکھے ہیں۔ وہ جب بھی کچھ لکھتے تو اس کا مقصد ان کے پیش نظر ضرور ہوتا تھا۔ طنز و مزاح لکھنا بہت مشکل فن ہے اس میں اپنی ذات بھی نشانہ بنتی ہے اور دوسروں کی بھی۔ لیکن فکر اس معاملے میں قابل تعریف ہیں۔ دوسروں کی ذات کو نشانہ بناتے ہوئے احترام اور عزت کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑتے بلکہ ایک اعتدال پسند رویہ اپناتے ہیں۔ ان کا کالم 'پیاز کے چھلکے' عوام میں کافی مقبول ہوا تھا۔ ان کا اسلوب دلکش اور دلچسپ تھا۔ اپنی بات کو بڑے اچھے انداز میں کہنے کا ہنر انھیں آتا تھا۔

ڈاکٹر مہتاب امروہوی لکھتے ہیں:

''فکر تونسوی کی کالم نگاری کا نقطۂ عروج 'ملاپ' اخبار کا طنزیہ کالم پیاز کے چھلکے ہے۔ ملاپ میں انھوں نے تقریباً ایک چوتھائی صدی سے زیادہ عرصے تک طنزیہ و مزاحیہ کالم لکھے، ملاپ کا سیاسی رجحان کانگریس کی طرف تھا اور اس کے مالکان آریہ سماجی عقائد رکھتے تھے مگر ملاپ کے سیاسی و مذہبی مسلک سے اختلاف کے باوجود اخبار میں ایک طبقہ محض فکر کے کالموں کے لیے ملاپ پڑھنے پر مجبور تھا۔ پیاز کے چھلکوں میں آخر ایسی کون سی بات تھی جس نے فکر کو اتنا ہر دلعزیز بنا دیا۔ پیاز کے چھلکے اور فکر تونسوی تقریباً تیس سال تک ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے صحافت کی شاہراہ پر چلتے رہے، کبھی پیاز فکر تونسوی کے لیے لقمہ سخت بن جاتی تھی اور کبھی وہ اسے کچا چبا لیتے تھے۔ ہر روز پیاز کے چھلکے اتارنا اور پھر اگلی صبح دوسری پیاز کے چھلکے اتارنے کے لیے خود کو تیار کرنا اتنا آسان کام نہیں۔'' (فکر تونسوی ایک طالعہ: ڈاکٹر مہتاب امروہوی، دہلی 2006، ص126)

فکر تونسوی کے کالم ادبی چاشنی سے بھرے ہوئے ہیں۔ وہ خالصتاً ادب کے آدمی تھے۔ اس لیے اپنے مضامین میں ادب کو ملحوظ خاطر رکھا۔ ان کے کالموں کی یہ بھی خاصیت ہے کہ پڑھنے والا آخر تک پڑھے بغیر نہیں چھوڑ سکتا۔ فکر تونسوی کے قلم کی تاثیر قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتی تھی۔ وہ اپنی تحریروں میں طنز و ظرافت کو کچھ اس طرح ملا دیتے ہیں کہ پڑھنے والا تعریف کرنے پر

مجبور ہو جاتا ہے۔

فکر تونسوی 7 اکتوبر 1918ء کو شجاع آباد ضلع ملتان میں پیدا ہوئے۔ فکر تونسوی کا پورا نام رام لال بھاٹیہ تھا۔ ان کے والد کا نام دھنپت رائے تھا۔ فکر اپنے پانچ بھائی بہنوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ شجاع آباد میں ان کے والد نوکری کرتے تھے لیکن ان کا آبائی وطن تونسہ تھا۔ بعد میں وہ تونسہ ہی آ کر آباد ہو گئے۔ تونسہ آنے کے بعد دھنپت رائے نے اپنا کاروبار شروع کیا لیکن اِس کاروبار میں بہت زیادہ کامیابی نہیں ملی۔ فکر تونسوی کی ابتدائی تعلیم گاؤں کے مدرسے میں ہوئی۔ مڈل اسکول مگروٹھ اور پھر ہائی اسکول تونسہ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد ایمرسن کالج ملتان میں داخلہ لیا۔ اِس دوران ان کے والد چل بسے۔ والد کی موت کی وجہ سے ان کی تعلیم پوری نہیں ہو سکی۔ گھر کی حالت بہت اچھی نہیں تھی اس لیے فکر کو بھی ذریعہ معاش کی تلاش کرنی پڑی۔ فکر تونسوی کی تحریر بہت خوبصورت تھی۔ اِس خوبصورتی کی وجہ سے انھیں ایک مقامی اخبار کسان میں ملازمت مل گئی۔ ایک سال تک وہ وہاں کام کرتے رہے۔ اخبار میں کام کرنے کے بعد انھوں نے کپڑے کی رنگائی پتائی کا بھی کام کیا۔ یہ کام بھی انھیں راس نہیں آیا تو پھر سائن بورڈ لکھنے لگے۔ جب اِس سے بھی دل بھر گیا تو مدرس کا پیشہ اختیار کیا۔ تنخواہ بہت کم تھی اِس لیے اس اسکول کی ملازمت کو بھی کچھ ہی مہینوں میں خیر باد کہہ دیا۔ اسکول کے کام کے بعد انھوں نے خوشبودار تیل فروخت کرنا شروع کیا لیکن ظاہر ہے کہ فکر جیسی لاابالی شخصیت کے لیے یہ کام کہاں موزوں تھا۔ اِسے بھی چھوڑ دیا۔ اب انھوں نے لاہور کا رخت سفر باندھا جہاں انھوں نے ایک رسالے من کی موج کی ادارت کی اور پھر ادب لطیف سے وابستہ ہو گئے۔ ادب لطیف سے جڑنے کے بعد ہی فکر تونسوی کو وہ ماحول میسر ہوا جس نے رام لال بھاٹیہ کو فکر تونسوی بنا دیا۔ ڈاکٹر محمد ممتاز فرخ اپنی کتاب فکر تونسوی: حیات و خدمات میں لکھتے ہیں:

> ''انھیں شیخ پورہ کے ایک ادبی اور نیم فلمی ہفتہ وار من کی موج کی ادارت مل گئی۔ اِس رسالہ سے آٹھ نو ماہ تک وابستہ رہے۔ اس کے بعد لاہور سے شائع ہونے والے ماہنامہ ادب لطیف میں بحیثیت کلرک ملازم ہوئے لیکن ڈیڑھ سال بعد انھیں ادب لطیف کا مدیر بنا دیا گیا۔ فکر تونسوی کو پہلی بار وہ ماحول ملا اور وہ فضا حاصل ہوئی جس کا بچپن سے ہی انتظار تھا۔ اس لیے انھوں نے ادب لطیف کی خدمت میں اور اس کی ترقی میں بہترین صلاحیتیں صرف کیں۔ ادب لطیف ایک معیاری رسالہ تھا جس کے ادبی رنگ و روپ نکھارنے میں فکر تونسوی نے گراں قدر خدمات انجام دیں۔ (ڈاکٹر ممتاز فرخ: فکر تونسوی حیات و خدمات، بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ ص 42)

ادب لطیف کے بعد انھوں نے 'سویرا' کی بھی ادارت کی۔ طنز و مزاح لکھنے سے قبل وہ شاعری کی جانب متوجہ ہوئے تھے۔ پہلی غزل انھوں نے آٹھویں کلاس میں تخلیق کی تھی جس کے کچھ اشعار یوں تھے:

وہی تو غضب سے جیتا وہی میں ادب سے ہارا
ابھی تو نے روک رکھا ہے کہیں کوئی اک اشارہ
تجھے بھا گئی ہیں کیونکر میری بے نماز نظریں
کہ امامِ شہر نے تو انھیں کفر گر پکارا

فکر تونسوی کے لاہور آنے کے بعد وہاں کی ادبی فضا میں ان کی شاعری کو ابھرنے کا خوب موقع حاصل ہوا۔ ادبی رسائل میں ان کی غزلیں، نظمیں تواتر سے شائع ہونے لگیں۔ 1944 میں کیلاش کماری ان کی رفیق سفر بن کر زندگی میں آ گئیں۔ بیوی کے آنے سے فکر کی زندگی میں اعتدال بھی آ گیا۔ پہلے کی لاابالی اور آزاد زندگی اب ایک ڈگر پر چلنے لگی۔ ان کی شادی کے محض 3

برسوں کے بعد ہندوستان کی آزادی اور تقسیم کا واقعہ پیش آتا ہے جس نے لاکھوں لوگوں کے ساتھ فکر کو بھی متاثر کیا اور انھیں لاہور سے نقل مکانی کر کے جالندھر آنا پڑا۔ وہ دسمبر 1947 میں پنجاب کے شہر جالندھر منتقل ہو گئے۔ وہاں انھیں جالندھر ریڈیو اسٹیشن میں ملازمت مل گئی۔ جالندھر میں فکر تونسوی نے رفتار اور نقوش نامی رسالے بھی شروع کیے۔ فکر تونسوی کے تین بچے ہیں۔ دو بیٹی اور ایک بیٹا۔ یہ سب اب دہلی میں رہتے ہیں۔

جالندھر سے نکلنے والے اخبار 'نیا زمانہ' میں آج کی خبر کا کالم لکھنے کی ذمہ داری فکر تونسوی کو دی گئی۔ 1954 سے 1955 تک وہ اِس اخبار سے وابستہ رہے۔ 1956 میں انھوں نے 'ملاپ' کے لیے پیاز کے چھلکے لکھنا شروع کیا۔ 'ملاپ' کے علاوہ بیسویں صدی اور دیگر رسائل و جرائد میں بھی ان کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین شائع ہو رہے تھے۔ کچھ مہینوں تک رسالہ 'شاہراہ' کی ادارت بھی کی۔ فکر تونسوی ہر فن مولا شخص تھے۔ شاعری کی، صحافت کے میدان میں زور آزمائی کی، ڈرامے لکھے، ناول لکھا، اسکرپٹ نگاری کی، طنز و مزاح لکھا، تنقید نگاری کی، روزنامچہ لکھا، آپ بیتی تحریر کی۔ غرض یہ کہ فکر تونسوی نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی لیکن وہ طنزیہ و مزاحیہ کالم نگاری کے ہی شہسوار کہلائے۔ فکر تونسوی کی تقریباً دو درجن تصنیفات ہیں جن میں چھٹا دریا، ساتواں شاستر، بدنام کتاب، فکریات، پیاز کے چھلکے، میری بیوی، گمشدہ کی تلاش وغیرہ کافی مقبول ہوئی تھیں۔ ''ہیولے'' ان کا شعری مجموعہ ہے۔'' پروفیسر بدھو'' ان کا طنزیہ ناول ہے۔ انھیں یوپی اور بنگال اردو اکادمی کے انعامات کے علاوہ پنجاب سرکار کا ادبی ایوارڈ اور غالب ایوارڈ بھی مل چکے ہیں۔ 12 ستمبر 1982 کو فکر تونسوی نے آخری سانسیں لیں اور اپنے پیچھے طنزیہ کالم نگاری کا بیش بہا خزانہ چھوڑ گئے جسے آج بھی پڑھ کر لبوں پر مسکراہٹ رینگ جاتی ہے۔

فکر تونسوی کے کچھ مضامین بے حد مقبول ہوئے تھے جن کے نام اِس طرح ہیں: بیویوں کی ٹریڈ یونین، وَر کے لیے کنیا کی ضرورت، محلّہ سدھار کمیٹی، وارنٹ گرفتاری، فکر تونسوی نے الیکشن لڑا، میرا پنر جنم، قبر سے واپسی، مکانوں کے نمبر، منی بس۔ ان مضامین کی مقبولیت کے پیش نظر انہیں اتر پردیش اردو اکادمی نے انتخاب مضامین فکر کے نام سے شائع بھی کیا تھا جسے دلیپ سنگھ نے ترتیب دیا تھا۔ وہ اِس کتاب کے مقدمے میں فکر کی صلاحیتوں کا ان جملوں میں اعتراف کرتے ہیں:

> ''فکر کو اپنی زندگی میں بے حد شہرت ملی لیکن اس نے کبھی اِس کا فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔ میری اِس سے تیس سال سے اوپر کی دوستی تھی۔ کبھی میں نے اُسے شہرت کے کندھے پر بیٹھ کر اپنا قد اونچا کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ فکر نے اردو میں لکھنا شروع کیا۔ تقسیم ملک کے بعد جب اردو کے کئی اور ادیبوں نے زیادہ معاوضے کی خواہش میں دوسری زبانوں کی طرف رجوع کیا۔ فکر اردو سے ہی جڑا رہا۔ اردو زبان کے لیے فخر کی بات ہے کہ فکر کی ادبی صلاحیت کی وجہ سے۔ فکر کی شہرت کم ہونے کی بجائے اردو کا نام بلند ہوا۔''
> (انتخابِ مضامین فکر تونسوی: دلیپ سنگھ، اتر پردیش اردو اکادمی)

اردو میں طنز و مزاح نگاری کو فکر تونسوی نے اپنے کالموں سے بہت مقبول بنا دیا۔ ان کا مزاح جدت لیے ہوئے ہے۔ پیاز کے چھلکے کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ لوگ اخبار پڑھنے سے پہلے پیاز کے چھلکے پڑھتے تھے۔ فکر کو روزانہ ہی یہ کالم لکھنا پڑتا تھا لیکن پھر بھی ان کے کالموں میں کسی طرح کی اکتاہٹ یا تکرار نہیں نظر آتی ہے۔ یہی فکر کی فکر تھی۔ تونسہ کے اس رام لال نے اردو

اخبار کے قاری کو پیاز کے چھلکے سے نئی بصیرت اور نئی آگہی فراہم کی۔ لوگ ان کے کالم کا بے صبری سے انتظار کرتے تھے۔ ان کے کالم محض دل بہلانے کا سامان نہیں تھے بلکہ ان میں ایک مقصد بھی چھپا ہوتا تھا۔ کرشن چندر جیسا عظیم ادیب بھی فکر تونسوی کی فکری و تحریری صلاحیتوں سے متاثر ہے۔ ملاحظہ کریں:

''فکر اپنے طنز و مزاح میں ہمیشہ ان مقاصد کے لیے لڑے ہیں جن کے لیے صدیوں سے انسانیت پرست ادیب ہر ملک اور ہر عہد میں لڑتے اور جدوجہد کرتے آئے ہیں۔ فکر نے اپنے مقصد کی آفاقیت اور اپنے فن کی بلوغت پر کبھی حرف نہیں آنے دیا۔ ان کا مقصد اعلیٰ ہے اور کہنے کا ڈھنگ نرالا ہے اس لیے ادب کی تاریخ میں وہ ہمیشہ عزت و احترام سے یاد رکھے جائیں گے۔'' (کرشن چندر: تعارف، فکرنامہ، انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی)

فکر تونسوی نے اپنے کالموں میں جو تنوع اور دلکشی طویل عرصے تک برقرار رکھی وہ بے مثال ہے۔ ان کی کچھ شگفتہ تحریریں ملاحظہ کریں، فکر بانی:

آپ نے گھر کا کوئی بہترین کام کر دیا تو اس کی داد آپ کو بیوی سے بھی نہیں ملے گی جو آپ سے بہتر کام کی توقع نہیں رکھتی ہے۔

بیوی آپ کو گھر کا کام کام کرنے کے لیے اٹھائے گی مگر کرنے نہیں دے گی کیونکہ اس کام کا کریڈٹ وہ خود لینا چاہتی ہے۔

بہ سلسلہ دروغ بیانی عرض ہے کہ:

بچہ جھوٹ بولے تو اسے برائی مانا جاتا ہے

جھوٹ بولنا عاشق کے لیے ایک فن بن جاتا ہے

کنوارے نوجوانوں کے لیے جھوٹ بولنا ایک کامرانی ہے

جھوٹ شادی شدہ عورت کی فطرت ثانیہ ہے

انسان وہ کھانے کے لیے مضطرب ہو جاتا ہے جسے کھانے کے لیے اُسے منع کر دیا گیا ہو۔

آپ جس شخص سے تعریف کی کبھی امید نہیں کرتے تھے۔ اگر وہ تعریف کر دے تو وہ نہایت کمینہ ہے۔

عورت کا زیور چوری ہو جائے تو وہ اپنے خاوند تک کو چور کہنے سے باز نہیں آتی ہے۔''

(بحوالہ 'فکر بانی'، فکر تونسوی، اہلوالیہ بک ڈپو، دہلی)

فکر صاحب جہاں عوام، حکومت، معاشرے کو نشانہ بناتے ہیں وہیں اپنے ساتھ ساتھ گھر والوں کو بھی نہیں بخشتے۔ اپنے مضمون یہ گھریلو جانور کی شروعات کچھ اس طرح کرتے ہیں:

میرے گھر میں کچھ اشرف المخلوقات رہتے ہیں اور کچھ مخلوقات اشرف المخلوقات کے طور پر میری بیوی، دادی، سالہ، والد (محترم) اور میرے بیٹے بیٹیاں رہتے ہیں اور مخلوقات کے طور پر ایک بلی، چند چوہے، ایک کتا، دو چڑیاں، ایک بکری اور ایک بھینس۔ کبھی کبھی کوئی سور بھی دوسرے سور سے ڈر کر ہمارے برآمدے میں آ کر بیٹھ جاتا ہے۔

اس مضمون میں انھوں نے بلی، چوہے، کتے اور چڑیا کا علیحدہ علیحدہ تذکرہ کیا ہے۔ ان کا ایک مضمون لو لیٹرز ہے جسے پڑھ کر یقیناً ہنسی آ جائے گی۔ اِس طرح کے مضامین ہی فکر صاحب کی شناخت ہیں۔ ملاحظہ کریں:

پیاری ہیلن!

کل جب تم بالکنی میں کھڑی اپنی لمبی، کالی، گھنی، بھیگی زلفیں جھٹک جھٹک کر سکھا رہی تھیں تو مجھے شک ہے کہ تم نے مجھ پر عاشقانہ نگاہ ڈالی تھی۔ میرا مطلب ہے کیا تمھیں بھی اِسی قسم کا کوئی شک ہوا تھا۔

یہ خط صرف وضاحت کی خاطر لکھ رہا کیونکہ یہ محبت کا معاملہ ہے۔ ممکن ہے اس میں مجھے ملازمت سے استعفیٰ دینا پڑے۔ خودکشی کی نوبت بھی آسکتی ہے۔ اِس لیے تمھاری طرف سے پوزیشن کی وضاحت چاہتا ہوں۔ میرا شبہ بھی ہوسکتا ہے۔ اِس لیے مشتعل مت ہوجانا کیونکہ میں بڑا شریف عاشق ہوں اپنی غلطی کی اصلاح بھی کرسکتا ہوں۔ اس لیے بڑے ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ جواب دینا۔

نوٹ: مجھے تمھارا اصلی نام معلوم نہیں تھا۔ اس لیے ایک کامن قسم کے رومانٹک نام ہیلن سے مخاطب کررہا ہوں۔ اس سے تمھارے والد صاحب کو بھی شبہ نہیں ہوگا کہ میری دختر نیک اختر کو عاشقانہ خطوط آتے ہیں۔ (کیا وہ صاحب جو لنگڑا کر چلتے ہیں تمھارے ہی والد ہیں؟''

بحوالہ تمھارا بی سی ڈی

اب جواب بھی سن لیں:

میرے بی سی ڈی

ڈھیلے سے بندھا ہوا تمھارا خط ملا۔ پڑھ کر دل دَھک دَھک کرنے لگا۔ رات بھر نیند نہیں آئی۔ پہلے کھٹملوں کی وجہ سے نہیں آتی تھی اب تمھارے خط کی وجہ سے نہیں آئی۔ ہائے مجھے کتنی شرم آتی ہے کہ میں تم سے عشق کرتی ہوں، بھلا لڑکیاں بھی کبھی عشق کرتی ہیں؟ بہتر یہ تھا کہ یہ بات میرے ڈیڈی سے پوچھ لیتے کیونکہ ڈیڈی سے اجازت لیے بغیر میں کچھ نہیں کرسکتی۔ عشق تو ایک طرف ربن تک نہیں خرید سکتی۔ تمھاری۔ اے بی سی

(بحوالہ: وارنٹ گرفتاری، فکر تونسوی)

پیاز کے چھلکے میں انھوں نے بچے کتنے ہونے چاہئیں، ہندوستانی لباس، شادیوں کے سہرے، مکانوں کے نمبر، اور منی بسوں جیسے موضوعات کو شامل کیا ہے۔ دہلی کی منی بس پر تحریر کیا گیا ان کا نمک پارہ ملاحظہ کریں:

دہلی میں منی بسیں چلتی ہیں تو یوں لگتا ہے منی اسکرٹ پہنے فلم بوبی کی ہیروئن چھوکری جارہی ہے اور تکمیل شوق کی دعوت دیتے ہوئے کہہ رہی ہے آؤ تمھیں اپنے ساتھ لے چلوں۔

نظام الدین، بھوگل، لاجپت نگر۔''

فکر تونسوی زندگی کے ہر پہلو پر گہری نظر رکھتے تھے۔ وہ عام انسان کی زندگی سے بھی واقف تھے اور محلوں میں عیش و آرام سے زندگی بسر کرنے والے کا بھی حال جانتے تھے۔ ان کی طنز و مزاح نگاری میں کہیں نہ کہیں پند و نصائح کا ایک واضح پیغام نظر آتا ہے۔ طنز اور ہلکی پھلکی شگفتہ نثر کے ذریعہ وہ ہندوستان کے اردو قاری کو وہ سب کچھ سمجھا دیتے تھے جس کے لیے حکومتوں کو لاکھوں روپے اشتہار بازی پر خرچ کرنے پڑتے تھے۔ ان کا قلم بہت دھاردار تھا۔ اپنے ساتھ ساتھ سماج کے پورے نظام پر یہ دھار چلتی تھی۔ غریبوں کی حالت اور ان کے رہن سہن کے حوالے سے ان کی کئی ایسی تحریریں ہیں جنھیں پڑھ کر ہنسی نہیں آتی بلکہ اِس نظام پر اِس سسٹم پر غصہ آتا ہے۔ آج فکر تونسوی ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن ان کی تحریریں ہمیشہ ان کی یاد تازہ کردیتی ہیں اور ان کے مضامین آج کے حالات پر بھی پوری طرح صادق آتے ہیں۔

سیدہ بانو احمد

خودنوشت

ڈگر سے ہٹ کر

قصہ پارینہ:

آج کی دنیا میں موٹریں تو پرانی چیز ہوگئی ہیں۔ ہوائی جہاز، ہیلی کاپٹر، چاند تک پہنچنا، کہکشاں سے باتیں کرنا، پہاڑوں کی چوٹیاں سر کرنا، Rafting Surfing اور اس طرح کے سینکڑوں مشاغل روز کی باتیں ہیں۔ ہمارے نوجوان لڑکے لڑکیاں ان میں حصہ بھی لیتے ہیں اور ان کے بارے میں سنتے رہنے کی عادی ہیں۔ چھوٹے چھوٹے بچے بچیاں آئے دن ہوائی جہازوں میں آتے جاتے رہتے ہیں۔ نہ انہیں ڈر لگتا ہے نہ وہ گھبراتے ہیں۔ دنیا اس قدر بدلی ہے کہ تصور میں بھی اندازہ نہیں لگایا جاسکتا کہ آج سے سو برس پہلے کی دنیا کیا ہوگی۔ ہمارے زمانے میں بھونپو والا گریموفون ایجاد ہوا تو دھوم مچ گئی۔ ایک گول پلیٹ میں سے گانے نکلتے تھے سب حیران ہوکر سنتے تھے۔ میری والدہ کی عمر اس وقت کوئی پندرہ سولہ برس کی ہوگی۔ وہ بتاتی تھیں کہ اس قدر سستے کا زمانہ تھا کہ گھر کی ایک خادمہ کی تنخواہ آٹھ آنے مہینہ ہوتی تھی یہ کوئی ۸۵۔۱۸۸۰ء کی بات ہوگی۔ تعجب ہے کہ اس قلیل تنخواہ میں گزر بسر اچھی طرح ہو جاتی تھی۔ مردوں کی دنیا بالکل الگ تھی۔ مردانے مکان میں مالک مکان مع لڑکوں اور مرد رشتہ داروں کے رہتے تھے۔ مرد نوکر ان کی خدمت گزاری کرتے تھے۔ عورت مرد کی تنخواہوں میں تفریق جب بھی تھی۔ مرد نوکر کو ایک روپیہ مہینہ ملتا تھا۔ زنانے مکان میں سارا کام عورتیں بجالاتی تھیں۔ گرمیوں میں آنگن میں سونے کا رواج تھا۔ خادمائیں ہلکے بھاری سب پلنگ آنگن میں بچھاتیں۔ سب کے بستر لگاتیں اور پھر صبح سارے پلنگوں کو اٹھا کر ان کی جگہوں پر رکھتیں۔ غرض کہ گھر کی ساری ذمہ داری ان کے کاندھوں پر ہوتی تھی۔ زندگی میں معاشرت کے بندھنوں نے ایک ہم آہنگی پیدا کر دی تھی۔ عورتیں اور مرد بس چند گھنٹوں کے لیے یک جا ہوتے۔ اس لیے گھر کی فضا میں کھنچاؤ پیدا ہونے کا امکان کم سے کم ہوگیا تھا۔ شادی بیاہ کی خوشیاں کچھ اسی طرح کی تھیں جیسے آج ہیں۔ سائنس کی برکتوں نے جو آفت مچا رکھی ہے ان کا کوئی وجود نہیں تھا، لوگ بیل گاڑیوں اور ڈولیوں میں سفر کرتے تھے۔ پالکی ایک کمرہ ایسی چیز ہوتی تھی جس میں چار بڑے بڑے ڈنڈے مضبوطی سے لگا دیئے جاتے تھے۔ ڈبے میں مسافر بیٹھ گئے اور آٹھ آدمیوں نے ڈنڈے کاندھوں پر رکھ لیے اور چل دیئے۔ آگے کے چار کہار بولتے جاتے تھے۔ تالی ہے، ہوشیار، گڈھا ہے ہوشیار، پلیا ہے ہوشیار۔ پیچھے کے کہار چوکس ہو جاتے۔ قدم سنبھال کر رکھنے لگتے کہ آگے نالی ہے یا گڈھا پار کرنا ہے۔ میانہ یا ڈولی پالکی سے چھوٹی ہوتی تھیں۔ ان میں ایک یا زیادہ سے زیادہ دو ہلکے پھلکے لوگ بیٹھ سکتے تھے۔ مسافروں کی حفاظت کے لیے دو چار سپاہی اور دو چار ذمہ دار نوکر پیدل چلتے تھے اور دو کوس چل کر سب لوگ تھوڑی دیر آرام کر کے روانہ ہوتے تھے۔ ایک کوس دو میل کا ہوتا تھا۔

میری والدہ ۱۹۰۱ء میں کوئی ۲۷ سال کی تھیں۔ ہمیں ان کی عمر کا اندازہ اس طرح ہوا کہ ان کی جب شادی ہوئی تو وہ ۱۴ برس کی تھیں۔ پھر ہم نے ان ہی سے سنا کہ ہماری بڑی بہن عالیہ خاتون شادی کے تیرہ سال بعد پیدا ہوئی تھیں۔ اس طرح ہم نے اماں کی عمر کا حساب لگایا تھا۔ اماں کی شادی کی واردات بھی دلچسپ ہے۔ میرے والد کی پیدائش کے وقت ان کی ماں کا انتقال ہوگیا تھا اور میرے دادا نے بعد میں دوسری شادی کر لی تھی۔ کچھ عرصے تو

سوتیلی ماں نے میرے والد کی پرورش کا بار بہت ذمہ داری سے اٹھائے رکھا پھر بتدریج میرے باپ سوتیلی ماں کی بدسلوکیوں کا نشانہ بننے لگے۔ وہ ذرا بڑے ہوئے تو میرے دادا نے نہیں پڑھنے کے لیے لکھنو بھیج دیا۔ میرے والد کو پڑھنے لکھنے کا بہت شوق تھا اور جب انہوں نے میٹرک پاس کرلیا تو سب کو یہ محسوس ہوا کہ اس بچے نے تو تعلیم کی بڑی اونچی ڈگری حاصل کرلی ہے۔ اب اس کی شادی ہو جانی چاہیے۔ میرے والد اپنی ماں کی اکلوتی اولاد تھے اور میری والدہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ چنانچہ میرے دادا نے بڑے چاؤ سے شادی رچائی۔ دلہن رخصت کرا کے ردولی ضلع بارہ بنکی سے اسولی ضلع سلطان پور پہنچے تو میری دادی نے اپنے سوتیلے پن میں گھر میں چراغ نہیں جلنے دیئے۔ گھر میں گھپ اندھیرا تھا۔ میرے دادا ناراض ہوئے ہوں گے اور پھر چراغ جلائے گئے ہوں گے۔ دلہن اتاری گئی ہوگی۔

اس وقت اس علاقے میں ریلوے لائن نہیں بچھی تھی۔ قافلے کے قافلے پیدل چلتے تھے اور صاحب استطاعت لوگ اور بیویاں پالکی میں سفر کرتی تھیں۔ میری ماں نے اسی طرح ردولی سے اسولی تک کی مسافت طے کی ہوگی۔ چودہ سال کی عمر۔ غیر مانوس حالات کا سامنا، کیا گزری ہوگی ان پر۔ لیکن اس زمانے کی معاشرت میں لڑکی ہوش سنبھالتے ہی یہ سنتی رہتی تھی کہ اسے پرائے گھر جانا ہے۔ سینا پرونا، کھانا پکانا، بھائیوں کا خیال رکھنا گھٹی میں پلایا جاتا تھا۔ بارہ تیرہ سال کی عمر سے ہی سہیلیوں کا چھیڑنا شروع ہو جاتا تھا۔ دولہا بھائی کا ان دیکھا وجود۔ اچھے اچھے کپڑے، گہنا، زیور، دلہن بننے کا ارمان، ساس نندوں کے طعنے اور ظلم کی کہانیاں بچیوں کے کان میں پڑتی رہتی تھیں۔ پڑھنا لکھنا لڑکیوں کے لیے ایک معیوب بات تھی۔ لکھنا تو لڑکی کو آنا ہی نہیں چاہیے تھا خدا نخواستہ کسی رشتے ناطے کے بھائی سے کہیں آنکھ لڑ گئی تو لڑکی محبت کے خط لکھنے لگے گی۔

مردوں کی بنائی ہوئی دنیا میں عورت کو جاہل رکھنے میں بڑے فائدے تھے۔ اپنی مرضی کے مطابق اپنے لیے مردوں نے سب کچھ مہیا کرلیا تھا۔ نوکر چاکر بہ افراط ہوں یا نہ ہوں۔ ہر وقت کا اٹھنا بیٹھنا تو مردوں ہی مردوں کا ہے۔ سنجیدہ مشاغل بھی ہیں، مشاعرے، ادبی محفلیں، مناظرے، مصوری، خطاطی، تفریح، طبع کے لیے شطرنج، گنجفہ، پچیسی، تاش جوا، مے خواری بھی ہو جائے تو نظر انداز کردو۔ طوائفوں کا مجرا، رات رات بھر ہو، امرد پرستی کو بھی درگزر کردو۔ ادھر عوت چہار دیواری میں بند، رشتہ دار عورتوں سے گھری ہوئی، کڑھائی بنائی، زردوزی کا کام، چکن کے کام میں مری کی ماہر، مغلیہ کھانا پکانے میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ ایک سے ایک مزیدار ہانڈیاں بن رہی ہیں، مردانے میں پکا کر پہنچائی جارہی ہیں، چرچے ہو رہے ہیں کہ فلاں بیگم فلاں کی بیٹی غضب کا گیلانی خشکہ پکاتی ہیں۔ موتی پلاؤ ایسا ہوتا ہے کہ انگلیاں چاٹتے رہ جاو اور انڈوں کا حلوہ اف اف، کچی بریانی کا تو بس ذکر ہی نہ کرو۔ ان کھوکھلی باتوں باتوں پر معاشرت کی ایسی بنیاد رکھی گئی تھی کہ عورتیں دم نہیں مار سکتی تھیں۔ اشارتاً بھی اس شکایت کا امکان نہیں تھا کہ ہم عورتیں زنانے میں قید ہیں اور باہر یہ رنگ رلیاں، اصل بات تو یہ تھی کہ زبردست کا بول بالا۔ پر تو کاٹ ہی دیئے گئے تھے۔ عورتیں پوری طرح مرد کی دست نگر تھیں۔ سر اٹھانے کے راستے بند تھے۔ ناانصافی کے ان حالات سے وہ مصالحت کر چکی تھیں۔ خوش بھی رہتی تھیں اپنے نصیبوں کو روتی بھی تھیں۔ یہ تھا ایک پہلو ہماری معاشرت کا۔ ساتھ ہی دوسرا یہ تھا کہ زنان خانے کی ایک الگ تہذیب تھی۔ مرد اندر آتے تھے تو درجہ بدرجہ خادماؤں کا سلام قبول کرتے، بچیوں کو محبت سے گود میں اٹھا لیتے، بیٹوں کے سروں پر ہاتھ رکھتے، بہوؤں کو دعائیں دیتے، ماں اور دوسری بزرگ خواتین

کوادب سے سلام کرتے ہوئے ایک فراغت کے انداز سے بیٹھ جاتے۔ سب کا حال احوال پوچھتے کوئی مسائل سامنے رکھے گے تو نہایت ذمہ داری سے انہیں سلجھانے کا انتظام کرتے۔ گھر میں ایسے خوش خوش ہنستے بولتے ہوئے داخل ہوتے کہ گھر کی ساری فضا شگفتہ ہوجاتی۔ یہی تربیت بیٹوں، بھانجوں اور بھتیجوں کو بھی دی جاتی کہ زنان خانے کی تہذیب میں ادب، سلیقہ اور حفظ مراتب کا حد درجہ خیال رکھا جائے۔ ایسی معاشرت بنا کر مرد نے عورت کو بھی اندرون خانہ ایک اونچا مقام دے دیا تھا۔ خاندان کے تمام اہم مسائل کے بارے میں بڑی اماں بیوی اور دوسری بزرگ رشتہ داروں کے مشورے اور خواہشات کو بلند درجہ حاصل تھا۔ اس طرح گویا ان تمام زیادتیوں اور نا انصافیوں کی تلافی ہوتی رہتی تھی۔ جنہیں اس زمانے کے زیادہ تر مرد شاید محسوس ہی نہیں کرتے تھے کہ یہ زیادتیاں ہیں۔ ہندوؤں میں بھی پردہ تھا اور رہن سہن کا ڈھنگ تقریباً ایسا ہی تھا جیسا میں نے بیان کیا۔ اندرون خانہ عورت کی حکومت تھی اور عزت اور احترام کی ان کی جگہ کی جڑیں بہت مضبوط تھیں۔ میں نے اتنی لمبی داستان اس لیے یہاں لکھ ڈالی کہ میری ماں اس ماحول کی بیٹی تھیں۔ سسرال گئیں تو خوشگوار خیر مقدم نہیں ہوا۔ دوسرے دن میرے والد نہیں ردولی واپس لائے اور ان سے کہا کہ ''میں مزید تعلیم حاصل کرنے لکھنو جا رہا ہوں تم اپنے ماں باپ کے پاس رہو۔ میں چھٹیوں میں آتا رہوں گا۔ چہ می گوئیاں تو ہوئی ہوں گی لیکن پھر میری والدہ کبھی سسرال نہیں گئیں۔ میرے والد نے سارے معاملے کو کس طرح سلجھائے رکھا مجھے نہیں معلوم۔ اتنا معلوم ہے کہ پھر اُنہوں نے کرسچن کالج لکھنو سے ۱۸۸۵ء میں بی اے پاس کرلیا۔ اس زمانے میں کسی ہندوستانی کا بی اے کر لینا انگریزوں کی نگاہ میں بڑی وقعت رکھتا تھا۔ پرنسپل اور ٹیچر سبھی انگریز ہوتے تھے۔ کسی انگریز کی سفارش پر نواب سلطان جہاں بیگم والئی بھوپال نے میرے والد میر ماجد حسین کو اپنے ولی عہد نواب زادہ نصر اللہ خاں اور ان کے چھوٹے بھائی نواب زادہ عبداللہ خاں کے لیے انگریزی پڑھانے کے عہدے پر مقرر کر دیا۔ شاہزادوں کے استاد اور وہ بی انگریزی کے اتالیق۔ بڑا بھاری عہدہ مانا جاتا تھا، اس دور میں استاد کی عزت بھی بہت کی جاتی تھی۔ سنا ہے کہ میرے والد کے سامنے دونوں شاہزادے اس وقت تک کھڑے رہتے تھے جب تک میرے والد بیٹھ نہ جائیں۔ یہ بات لگ بھگ ۱۸۸۵ء کی ہوگی۔ میرے والد کی رہائش کے لیے انہیں ایک مکان اور گھوڑا گاڑی بھی مہیا کر دی گئی۔ حالات سازگار ہوئے تو میرے والد ردولی جا کر میری والدہ کو بھوپال لے آئے۔ بارہ بنکی کے ضلع میں قصبہ ردولی سے بھوپال آنا جانا آج کی دنیا میں ایسا ہے جیسے کسی دیہاتی کو نیویارک لے جا کر Manhattan میں کھڑا کر دے۔

سلطان جہاں کا بھوپال: بھوپال کی سرزمین پر چار پشتوں سے عورت حکومت کر رہی تھی۔ وہ برقعہ اوڑھ کر تخت پر بیٹھتی تھی سارے وزیر امیر اس کے دربار میں حاضر ہوتے۔ جھک کر کورنش بجالاتے اور باادب باملاحظہ کھڑے رہتے۔ جب تک کہ سرکار عالیہ کی طرف سے اشارہ نہ ہوتا کہ ہاں بیٹھ سکتے ہو۔ نتیجہ یہ کہ عورت کا درجہ غیر شعوری طور پر بلند ہوگیا تھا۔ اودھ کی قدامت پسند دنیا کی گھٹن یہاں نہیں تھی۔ بھوپال میں نواب سلطان جہاں بیگم کی حکومت تھی۔ انہیں ثابت کرنا تھا کہ وہ عقل وفہم میں کسی مرد سے کم نہیں ہیں۔ انہیں فکر تھی عورت کی بہبودی کی کہ اسے جہالت کے اندھیرے سے نکالیں۔ اس کے تعلیم حاصل کرنے کا انتظام کریں اور قید و بند کی زندگی سے نکالیں۔ ایک دن میرے والد میر ماجد حسین سے کہا گیا کہ اپنی بیوی کو سلام کرنے کے لیے بھیجو ہمارے پاس۔ کیا پردے میں بٹھا رکھا ہے۔ میری ماں کا لباس بارہ گز کا فرشی پیجامہ، چولی اور ڈھائی گز کا دوپٹہ ہوتا تھا چنانچہ وہ اپنا

پائینچہ سنبھالتی ہوئی سرکار کے سامنے حاضر ہوگئیں۔

''بیٹھ جاؤبی بی''

عموماً سرکار عالیہ اسی طرح مخاطب ہوتی تھیں۔ پھر احوال پوچھتیں اور ہر درجہ کی عورت کے ساتھ اس طرح بات چیت کرتیں کہ وقتی طور پر اونچ نیچ کا فرق مٹ جاتا، یہ گویا سرکار عالیہ کی سوجھ بوجھ اور حکمت عملی کی علامت تھی۔

اماں کے ساتھ یہی ہوا۔ سرکار نے اماں کے اودھی لباس کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔ یہ ضرور کہا کہ اشرف النساء آپ ہر جمعہ کو ہم سے ملنے ضرور آیا کیجیے۔

اب گویا ہر جمعہ کو جس طرح سے بھی بنتا اماں احمد آباد محل جاتیں اور سرکار سے باتوں باتوں میں ردولی کی محدود دنیا، وہاں کی ریت رسمیں، عورتوں مردوں کے رہن سہن وغیرہ کا حال معلوم کرتیں۔ پھر ایک دن بول اٹھیں کہ ''بی بی یہ تمہارے لباس نے تو تمہیں بالکل قیدی بنا رکھا ہے۔ آپ بھوپال کا لباس پہنئے بہت آرام رہے گا''۔ یہ کہہ کر بیگم صاحبہ نے اپنے توشہ خانہ سے ایک بھوپالی جوڑا منگوایا اور حکم دیا اپنی سکریٹری کو کہ اشرف النساء پیا کو اندر لے جا کر یہ کپڑے پہنواؤ۔ بھوپال میں پیا کا لفظ بیگم کے مترادف ہے۔ اماں نے وہ کپڑے پہنے۔ بیگم بھوپال کو سامنے آ کر سلام کیا اور پھر اجازت لے کر گھر آ گئیں۔ سنا ہے کہ گھر آ کر بہت الجھتی رہتیں کہ 'یہ کیا مصیبت آئی''۔ اب جب بھی وہ احمد آباد محل جاتیں پھوپالی جوڑا پہن لیتیں۔ بالآخر ایک دن بیگم بھوپال نے کہہ بھی دیا کہ ''بی بی اور کپڑے بنواؤ تم تو بس میرا دیا ہوا جوڑا پہن کر میرے سامنے آ جاتی ہو، بھوپالی کپڑے پہننے کی عادت تو ڈالو''۔

اماں کو پھر چوڑی دار پاجامے بنوانا ہی پڑے اور دھیرے دھیرے انہوں نے محسوس کیا کہ واقعی جوڑی دار پاجامہ میں کہیں زیادہ سہولت ہے۔ بہ نسبت بارہ گز کے فرشی پاجامے کے بتدریج انہوں نے اپنے لباس ترک کر دیا اور بھوپالی کپڑے ہی پہننے لگیں مگر انہوں نے پانچ گز کا دوپٹہ کبھی نہیں اوڑھا۔ اس کا اوڑھنا کچھ فرشی پاجامے ہی سے ٹکر لیتا تھا۔

میرا بچپن ویسا ہی تھا جیسا عام طور سے متوسط گھرانے کا ہوتا ہے۔ فرق صرف یہ تھا کہ میں بھوپال میں پیدا ہوئی تھی۔ جہاں کئی پیڑھیوں سے عورت کی حکومت تھی۔ اس کا پلہ بھاری تھا، یہاں وہ گھٹن نہیں تھی جو شمالی ہندوستان کے دوسرے شہروں میں تھی۔

بھوپالی وندھیاچل پہاڑوں میں واقع چٹانوں پتھروں کی ایک وادی سی ہے۔ کئی کئی تالاب ہیں۔ بڑی بڑی سپاٹ چٹانیں ہیں۔ گھنے جنگل ہیں جن میں شیر، چیتے، سانبھر، ہرن، لکڑ بگھے، گیدڑ، سبھی بہ افراط پائے جاتے ہیں۔

غرض کہ یہاں ایک آزاد فضا تھی جس میں قدرتی خوبصورتی اور دل فریب مناظر تھے اور انسان کی بنائی ہوئی عمارتیں بھی تھیں جو اس زمانے کے رہن سہن پر روشنی ڈالتی تھیں۔ صدر منزل محل اتنا بڑا تھا کہ کم سے کم بیس پچیس خاندان ایسے آرام سے رہ سکتے تھے کہ کسی کو کسی کی خبر نہ ہو۔ رہائشی کمرے، آنگن، باورچی خانہ، شاگرد پیشے، غسل خانے وغیرہ غرض کہ ایک مکان میں تمام رہائشی فراغتیں مہیا تھیں اور ساتھ ہی ہر گھر ایک دوسرے سے منسلک ہوتے ہوئے بھی ایک الگ مکان تھا۔ جس میں خاندان کی آزادی میں خلل نہیں پڑتا تھا۔

عالی منزل کی عمارت میں خواتین کا کلب تھا جس سے ملحق بچوں کے کھیلنے کے لیے ایک بہت بڑا باغ تھا۔ درختوں میں جھولے پڑے تھے اور بچوں کی تفریح کے جملہ اور سامان بھی جمع تھے۔ اوپر نیچے پھسلنے کے لیے ڈھلوان، سوگز کی دوڑ کے لیے کھلا میدان۔ Girl Guide کی مصروفیتوں کے واسطے ایک الگ حصہ

اور آنکھ مچولی کے لیے ایک علاقہ جس میں ایک دوسرے کو ڈھونڈ نکالنا مشکل تھا۔

ولی عہد نواب نصر اللہ خان کا محل قران السعدین عیدگاہ پہاڑی کی چوٹی پر بنا ہوا تھا۔ شملہ پہاڑی پر واقع نواب عبید اللہ خان کی بے حد پر فضا کوٹھی، شملہ کوٹھی کہلاتی۔ یہاں سے پھوپال کا بڑا تالاب اور نیچے کا منظر بے حد خوب صورت تھا۔ پھر دوسری عمارتیں جو اپنی انفرادی حیثیت رکھتی ہیں۔ راحت افزا احمد آباد محل کی شکارگاہ قلعہ اور نور الصباح وغیرہ وغیرہ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھیں۔

خواتین کا کلب نواب سلطان جہاں بیگم نے خاص طور سے عورتوں کے لیے قایم کیا تھا اور ان کا حکم کہ ان کے وزیر وزراء کی بیسیاں زیادہ سے زیادہ تعداد میں ہر جمعہ کو کلب ضرور آئیں۔ عورتیں پردے میں تھیں اور اس زمانے کے دستور کے مطابق شادی بیاہ اور مرنے جینے کے موقعوں پر ہی گھر سے نکلتی تھیں ورنہ چہار دیواری میں بند۔ سرکار عالیہ سلطان جہاں بیگم عورتوں کی ترقی کی راہیں ڈھونڈ رہی تھیں چنانچہ کلب جانے کی پابندی میں عورتوں کو ہفتے میں ایک مرتبہ گھومنے نکلنے کا موقع مل ہی جاتا تھا پھر بتدریج ان میں یہ بھروسہ پیدا ہونے لگا کہ باہر کی فضا کو وہ خوش آمدید کہہ سکیں۔ میں نے جب ہوش سنبھالا تو دیکھا کہ عورتیں پکنک بہت مناتی تھیں۔ پکنک کو بھوپال میں گوٹ کہتے ہیں۔ آئے دن سننے میں آتا کہ ہم لوگ گوٹ پر جارہے ہیں۔ گوٹ پر جانے کے بڑے اہتمام ہوتے تھے۔ کسی باغ یا شہر سے باہر کسی گاؤں یا کسی شکارگاہ پر گوٹ منائی جاتی۔

خواتین کھانے پینے کی چیزوں کے ساتھ دو تین خادماؤں، نگرانی کے لیے ایک دو مرد نوکروں کے ساتھ بیج گاڑیوں میں روانہ ہوتیں۔ گاڑی بان اور مرد نوکروں سے ہمارا کا ناپردہ ہوتا تھا۔ یعنی وہ ہم لوگوں کی پرچھائیاں ہی دیکھ کر اپنا منہ دوسری طرف کر لیتے تھے۔ بیج گاڑی میں پیال اور نرم گدے نہایت آرام دہ ہوتے تھے۔ گاڑی کی شکل کچھ یوں تھی۔ ان کو دو بیل کھینچتے تھے۔

گھروں میں باورچی خانہ آنگن کے دوسرے سرے پر ہوتا۔ چولہوں میں لکڑی جلتی تھی۔ باورچی خانے کے سامنے پردے کی دیوار ہوتی تھی۔ باہر جانے کی دیوڑھی باورچی خانے سے ملحق ہوتی تاکہ باورچی وہیں سے باورچی خانے میں داخل ہو جائے اور ادھر ہی سے واپس جائے۔ کھانا تیار ہو جاتا تو خادمائیں اسے دسترخوان تک لانے کی ڈیوٹی بجالاتیں۔ عام طور سے دالان میں تخت پر درمیان میں دسترخوان بچھتا اور آزو باز و بیٹھنے کی جگہ ہوتی۔

میرے یہاں وقت کی پابندی اور صفائی پر بہت زور دیا جاتا تھا۔ ہم ایک الائچی کا چھلکا بھی لاپرواہی سے ادھر اُدھر نہیں پھینک سکتے تھے۔ کونوں میں کوڑے دان رکھے ہوتے تھے۔ اس کام کے لیے دالان میں دو طرح کی رہائش تھی۔ ایک طرف اماں کے لیے تخت بچھا ہوا تھا جس پر گاؤ تکیہ پاندان چھالیہ رکھنے کی ٹوکری اور سلائی کی مشین رکھی ہوتی۔ یہ گویا اماں کا ڈرائنگ روم تھا۔ ملنے جلنے والی بیبیاں آتیں تو اسی تخت پر نشست ہوتی۔ پان کھاتیں، گفتگو شروع ہوتی ''اے اوئی بی بی تم نے سنا'' بھلا کہیں ایسا غضب دیکھا ہے ''نوج خدا نہ کرے'' کلجگ ہے کلجگ'' وغیرہ وغیرہ قسم کی باتیں ہوتیں۔ میری والدہ بولتی کم تھیں بس مسکراتی رہتیں۔ عورتوں اور لڑکیوں کے کپڑے سب گھر میں سل جاتے تھے نوکرانیاں اور صاحب خانہ دونوں ہی سلائی میں ماہر ہوتی تھیں۔

دالان کے دوسرے سرے پر ایک صوفہ اور دو چار کرسیاں ہوتیں۔ یہاں انگریز خواتین کو بٹھایا جاتا جو زیادہ تر مشنری عورتیں تھیں۔ ان کا مشن یہ تھا کہ عیسائی مذہب کو زیادہ سے زیادہ فروغ دے سکیں۔ وہ یہ فرض بڑی خوبی سے ادا کرتی تھیں۔ ظاہر

نہیں ہونے دیتیں کہ ان کا مقصد کیا ہے بڑے اخلاق سے ملنے آتیں۔ کوئی بیمار ہو تو دوا تجویز کرنے اور تیمار داری کا ڈھنگ سکھانے لگتیں۔ کسی کو چوٹ لگ گئی ہے، کوئی زخم ہے تو مرہم پٹی کرتیں۔ غرض کہ وہ عام طور سے دلوں میں گھر کرنے کا طریقہ اپناتیں اور کافی مقبولیت حاصل کر لیتی تھیں۔

کمروں کے دروازے کھڑکیاں سب آنگن کی طرف کھلتے تھے۔ باہری دیواروں میں کوئی کھڑکیاں نہیں تھیں اس طرح باہر کی دنیا کی جھلک دیکھنے کا قطعی کوئی امکان نہیں تھا۔ ہمارا محلّہ امیر گنج کہلاتا تھا۔ واللہ عالم کیوں یہاں سارے گھروں کا نقشہ ایک سا تھا۔ سارے گھر ایک منزلہ اور چھت کھپریل یعنی Tiles کی تھی۔ اس طرح یہ امکان بالکل ختم ہو گیا تھا کہ عورت کبھی بالائے بام جا سکے۔ ان یکساں گھروں کے سلسلے کے عین وسط میں ہمارا گھر تھا۔ جس کی چھت کھپریل کی نہیں تھی اور ہم سب بچے بالائے بام خوب اودھم مچاتے تھے۔

ہمارے گھر کا نام انیس منزل تھا۔ یہ نام کس نے اور کیوں رکھا مجھے نہیں معلوم اور نہ ہمیں کبھی اس کی جستجو ہوئی کہ معلوم کریں۔

اس زمانے میں سنیما، ٹی وی، ویڈیو وغیرہ جیسے مشاغل تو تھے نہیں۔ گھر کے نوکروں کے ساتھ برتاؤ میں بڑی اپنائیت تھی۔ میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھیلتی تھی تو نوکرانیوں کے بچے بھی برابر کے شریک رہتے۔ ایک دلچسپ تفریح بچوں نے بڑوں کے لیے مہیا کر دی تھی۔ گھر کا کوئی پرانا نوکر، خادمہ یا کوئی بڑی بوڑھی نے اپنا یہ انداز بنا لیا تھا کہ وہ کسی چیز سے چڑتی تھیں۔ مثلاً ایک بوڑھے خادم کی چڑ تھی، ''جلیبی''، ہم بچوں نے جمع ہو کر کہنا شروع کیا جلیبی جلیبی اور بوڑھے میاں سارا کام چھوڑ کر الگ جا کھڑے ہوئے اور لگے چلانے۔ ''میاں دیکھ لو اب میں کام کیسے کروں بی نے تو وہ نام لے لیا۔ میرے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے، میاں کام کیسے کروں چکر آ رہے ہیں، ہائے میں مرا وہ دیکھئے وہ مجھے جن نظر آ رہے ہیں، بلا رہے ہیں میاں مجھے۔'' غرض کہ بڑے میاں نے خوب ڈھونگ رچایا۔ ہم لوگوں کا ہنسی کے مارے بُرا حال ہوا، بڑوں کو بھی لطف آ رہا تھا اور کلومیاں کو تسلیاں دی جا رہی ہیں۔ کوئی پنکھا جھل رہا ہے، کوئی پانی کا گلاس لیے دوڑا آ رہا ہے لو کلومیاں تھوڑا پانی پی لو۔ غرض کہ خوب تماشا رہتا۔ گھنٹے آدھ گھنٹے کی کلومیاں کو بھی کام سے فرصت مل جاتی۔ محلے میں سب ایک دوسرے کو جانتے تھے اور یہ بھی کہ کس کی کیا چڑ ہے۔ چنانچہ اکثر کہیں نہ کہیں سے شور اٹھتا اور ہم لوگ سمجھ جاتے کہ کہیں کوئی چڑ کا شکار ہو رہا ہے۔ بچوں کی دنیا بے حد معصوم تھی۔ سارے مشاغل دوڑ دھوپ کھیل کود اور اسکول جانے تک محدود تھے۔ کبھی کبھی نئی سوجھتی تو ہم اپنے بڑوں کو بھی ستانے کی ہمت کر بیٹھتے۔ مثلاً ہماری ایک سہیلی کے ایک بڑے بھائی تھے۔ ہم لوگ انہیں بھائی جان کہتے تھے۔ وہ ہمارے کھیلوں میں شریک ہو جاتے اور جس طرف ہو جاتے وہ پارٹی جیت جاتی۔ چنانچہ ہم لوگ اکثر ان کی خوشامد کرتے کہ وہ ہمارے ساتھ ہو جائیں۔ وہ جب مان جاتے تو ہماری چاندی ہو جاتی۔ بھائی جان پانچوں وقت کی نماز پابندی سے پڑھتے تھے۔ ان کے گھر کی رہائش یہ تھی کہ دالان کے پیچھے کے بڑے کمرے میں سفید چاندنی کا فرش رہتا تھا۔ جس پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر گاؤ تکئے لگے ہوتے۔ یہ کمرہ آج کل کے Living Room کا کام دیتا تھا۔ گھر کی بیگم صاحبہ جو تعظیماً کہلاتی تھیں۔ گاؤ تکیہ سے لگی بیٹھی ہوتی تھیں۔ سامنے پاندان اگالدان رکھا ہوتا۔ آزو بازو ملنے جلنے والی کوئی بی بی یا گھر کی دوسری رشتہ دار عورتیں بیٹھی ہیں۔ جو کسی کام میں مصروف ہیں یا پان بنا رہی ہیں۔ ایک جانب گھر کی لڑکیاں پچیسی کھیل رہی ہیں۔ یا کوئی اور کھیل۔ ململ کے پانچ گز کے دوپٹے اوڑھے جاتے تھے۔ جو رنگریز کے

یہاں رنگنے یا چھپنے جاتے تھے۔ پھر خادمائیں انہیں چنتی تھیں۔ رنگریز بھوپال کی زندگی کا جز تھا۔ ہر ہفتے جس طرح دھوبی یا دھوبن آتی ہے اسی طرح رنگریز آتا تھا اور خاندان کی تمام بیبیاں اپنے دو پٹے چھپنے کے لیے دیتی تھیں۔ دو پٹے کا چھاپا کرنے کے پھول بوٹوں کی طرح کا ہوتا تھا۔ آپ کسی طرح کا پھول دار نمونہ انہیں دے دیجئے وہ ہو بہو بالکل ویسا ہی نمونہ دو پٹوں پر چھاپ دیتے تھے۔ یہ ضرور تھا کہ وہ چھاپا کچا ہوتا تھا۔ دھوبی کے یہاں جا کر دوپٹہ بالکل سفید ہو کر واپس آتا اور دوسرے جمعہ کو وہ پھر چھاپنے کے لیے رنگریز کے سپرد کیے جاتے۔ اسی طرح چوڑی والی بھی ہر ہفتے گھر گھر جاتی اور دولہنوں، بڑی بوڑھیوں، بچیوں اور خادماؤں کو چوڑیاں پہناتی۔ یہ ہر جمعہ کا معمول تھا۔ بھائی جان اکثر اس کمرے میں جا نماز بچھا کر نماز شروع کر دیتے۔ ہنستی بولتی لڑکیاں یا بیگمات تعظیماً خاموش ہو جاتیں یا اٹھ کر ادھر اُدھر ہو جاتیں تاکہ بھائی جان سکون سے نماز پڑھ سکیں۔ ہم بچیوں کو ایک دن شرارت سوجھی۔ بھائی جان رکوع میں گئے پھر سجدے میں۔ کمر کا حصہ زمین سے کوئی آٹھ نو انچ اونچا ہو گیا۔ اس نو انچ کے فاصلے میں چپکے سے اگالدان رکھ دیا۔ اب بھائی جان سجدے سے اٹھے تو اپنے آپ کو اگالدان پر بیٹھا پایا۔ لاحول ولا قوۃ! نماز ختم ہو گئی۔ وضو ٹوٹ گیا!! ہم بچوں کا ہنسی کے مارے برا حال ہو گیا۔ پھر پکڑے گئے۔ سزائیں ملیں۔ بڑی سخت دھمکیاں دی گئیں۔

ہمیں یہ شرارت دہرانے کا بہت کم موقع ملتا، بھائی جان چوکنا ہو گئے تھے۔ ہر گھر میں دو دو تین تین خادماؤں کا ہونا عام تھا۔ اس زمانے میں تیز طرار مستعدی سے کام کرنے والی عورتوں کی تنخواہ ہوتی تھی دو دو پیہ مہینہ۔ بہت عمدہ کھانا پکانے والے باورچی کی پگار پانچ روپے مہینہ۔ انگریزی کھانا پکانے والے خانساماں کو پندرہ روپیہ مہینہ ملتا تھا۔ یہ بڑی اونچی تنخواہ جاتی تھی۔ اسی تنخواہ میں خوب کام سیکھی ہوئی آیائیں بھی مل جاتی تھیں۔ جو بے حد جی لگا کر محنت سے کام کرتی تھیں۔ اب وہ سب نہ جانے کہاں غائب ہو گئی ہیں۔

گھر کے ماحول میں یہ نوکرانیاں خوب گھل مل کر رہتیں۔ بڑی بیا سے ڈرتی تھیں تو چھوٹی بیا سے ہنسی مذاق کا ناطہ باندھ لیتیں، بچوں کے ساتھ محبت و شفقت اور ذمہ داری کا انداز رکھتیں۔ بعض بعض کاہل اور کام چور بھی ہوتی تھیں۔ لیکن عجیب رواداری برتی جاتی تھی کہ سب ہی کی گزر ہو جاتی۔ ایک عورت تھی بھائی جان کے گھر میں اس کی عادت تھی کہ کام سے فرصت پا کر بڑے کمرے میں فرش کے ایک کنارے چادر تان کے سو جایا کرتی۔ یہ عمل عام طور سے تین بجے سہ پہر سے شام کے پانچ چھ بجے کے درمیان ہوتا۔ پانچ بجے اسے پکار پکار کے جگایا جاتا وہ اٹھنے کا نام نہ لیتی۔ بڑی گہری نیند ہوتی تھی اس کی ایک دن حسب معمول وہ چادر تان کے سوئیں اور جب ہمیں اطمینان ہو گیا کہ وہ بالکل غافل ہو چکی ہیں تو ہم نے ایک موٹا تاگا لے کر ان کی چادر کو فرش کی چاندنی کے ساتھ سی دیا۔ گرمیوں کی دوپہر تھی۔ بڑا کمرہ خس کی ٹٹی اور پنکھے کے سہارے خوب ٹھنڈا تھا کسی کو خبر نہ ہوئی کہ ہم لوگوں نے کیا کیا ہے۔ اب آپ خود ہی سوچ لیجئے کے جب پانچ بجے کے بعد بی رحمت کو جگایا گیا اور انہوں نے پھڑ پھڑا کر اٹھنا چاہا تو کیا نظارہ ہو گا۔ اس دن ہم لوگوں کی بری طرح خبر لی گئی۔ یہ میں لکھ چکی ہوں کہ بھوپال میں کئی پیڑھیوں سے عورت حکومت کر رہی تھی۔ وہ نواب کہلاتی تھیں۔ وزیر وزراء سکریٹری، ناظم، جج، تھانیدار، تحصیل دار سب ہی مرد تھے۔ لیکن محکوم ایک عورت کے، دنیا کی تاریخ میں ایسا بہت کم ہوتا ہے لیکن جہاں ہوتا ہے وہاں حالات بہت مختلف ہو جاتے ہیں جب مرد برسر کار ہوتا ہے تو جہاں اچھائیوں کو سراہتا ہے وہاں برائیوں کی طرف سے چشم پوشی بھی کر سکتا ہے۔ عورت کو اس

ہزاروں برسوں کی پرانی دنیا میں بس کبھی کبھی موقع مل جاتا ہے کہ طاقت کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں آئے۔ چنانچہ نواب سلطان جہاں بیگم کا سارا انہماک اس میں تھا کہ ریاست کو ترقی کی راہ پر لگائیں۔ رعایہ کو راحت پہنچانے کے طریقے اختیار کریں۔ عورت کو جہالت کی تنگ گلیوں سے نکالیں۔ چنانچہ انہوں نے ''انیس سو تین چار'' میں لڑکیوں کے لیے کئی اسکول کھولے اور نہایت پرانے خیال کے خاندانوں کو مجبور کیا کہ وہ اپنی بچیوں کو اسکول بھیجیں ان کے حکم سے انحراف کہاں ممکن تھا۔ مخالفت ہونا ہی تھی۔ میرے والد بے حد روشن خیال تھے۔ انہوں نے میری بڑی بہن کے لیے گھر میں پڑھانے کا انتظام کر رکھا تھا۔ جب سرکار عالیہ نے سلطانیہ گرلز اسکول کھولا تو اسکول میں صرف چھٹے کلاس تک کی تعلیم کا انتظام تھا۔ میری بہن نے غالباً ۱۹۱۲ء میں چھٹا درجہ پاس کر لیا۔ اس وقت چھٹے درجہ تک کی تعلیم کو مڈل کلاس کہتے تھے میری بہن کی اس کامیابی پر نواب سلطان جہاں بیگم نے خاص دربار منعقد کیا اور انہیں بطور خلعت کے سونے کے کڑے اور دوشالہ عطا کیا۔ بھوپال میں سرکار کی طرف سے اعزاز کے طور پر دوشالے اور صافے دیئے جانے کا بہت رواج تھا۔ یہاں کا سرکاری لباس شیروانی اور صافہ تھا۔ سرکاری تقاریب میں بلاوا آتا تو میری والدہ کا اشرف النساء بیگم نام لکھا ہوتا یہ نہیں کہ بیگم ماجد حسین لکھا جائے۔ سب خواتین کا ان کے اپنے نام سے تعارف ہوتا۔ یہیں سے عورت کی انفرادیت کی ابتدا ہوتی تھی۔

ہمارے گھر کے ماحول میں ایک ایسی ہم آہنگی تھی کہ جس میں کوئی اتار چڑھاؤ نہیں پیدا ہوتا تھا۔ میں نے اپنے ماں باپ کو کبھی لڑتے یا بحث کرتے نہیں دیکھا۔ ایک پرمسرت ٹھہرا ہوا ماحول بنا رہتا۔

کبھی کبھی نوکروں میں لڑائی ہو جاتی۔ مقدمہ سنگین ہے تو میاں کے سامنے جاتا اور ہلکا پھلکا ہوتا تو اماں سنبھال لیتیں۔ پھر مجھے اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ اب میں گئی وہاں تو قدم قدم پر موازنہ ہوتا کہ ایں یہ عالیہ خاتون کی بہن ہے۔ یہ تو بہت کھلنڈری ہے۔ پڑھنے میں تو دل ہی نہیں لگاتی اور واقعہ بھی یہی تھا کہ میرا دل کھیل کود میں لگا رہتا تھا۔ پڑھنا تو بس واجبی واجبی تھا۔ استانیاں میری بہن سے شکایت کرتیں، بہن قہر بھری نظروں سے دیکھتیں۔ تادیب بھی کرتی رہتیں۔ مگر میرے خمیر میں اس قدر ڈھٹائی، شوخی، اضطرار اور معلوم نہیں کیا کچھ تھا جو مجھے اپنے بھائی بہن کی جانب سے کبھی بد دل نہیں ہونے دیتا تھا، نہ میں اپنے کو دکھی سمجھتی تھی۔ وقت گزرتا گیا اور میں نے بھی مڈل پاس کر لیا لیکن اب نہ دربار ہوا نہ مجھے خلعت ملی۔

☆☆☆

''کہانی کوئی سناؤ متاشا''

کی غیر معمولی مقبولیت کے بعد

صادقہ نواب سحر

کا

ایک اور ناول

''جس دن سے.....!''

قیمت: -/400 روپے

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔ دہلی

یادیں

تین مختلف عناصر جیسے مواقع، سکون اور وقت
ان تینوں کے ملنے سے بنتے ہیں ماہ و سال
سالوں، برسوں سے بنتے ہیں صدیاں
کسی میں ہم چل پاتے
کسی میں ہم نہیں ہوتے
ہم مانگنا چاہیں کلپ پُرس
حیاتِ جاویداں، دوامی زندگی

امرت اور دوامی حیات کے فرق کو
جانتا ہے صرف اندر پرستھ
بے شک ہے یہ اندر پرستھ
ضروری ہے اسے پالینا
کلپ پرش سے پہلے

اور کیا کیا جانتا ہے اندر پرستھ
وہ تو معلوم ہوگا اس کے ملنے پر
ان چھپی ہوئی خواہشوں کی روشنی میں
جو کچھ جھل مل کرتا نظر آتا ہے
وہی ہے اندر پرستھ
اسی کو تو کھوجنا ہے جو مل کر بھی نہیں ملتا
اور نہیں ملنے پر بھی سدا رہتا ہے ہمارے ساتھ
سایہ کی طرح قدم بہ قدم
کیا کھوجتا ہے

زندگی اور موت کے راز
لوک اور پرلوک کی باتیں
جنم سے پہلے کہاں تک
مرنے کے بعد کہاں ہوں گے
جیون کا مطلب کیا ہے
اس جنم سے اس جنم تک
ایک پل بنتا ہے اندر پرستھ
ملنے پر بھی کیوں دے گا اندر پرستھ
جو کچھ ہے اس کے پاس
کون کرتا ہے اپنی تجوری پوری طرح خالی
سمندر کی لہروں پر کھیلنے سے
نہیں دینا سمندر موتیاں
اپنی ذات کو لے جانا پڑتا ہے اس اونچائی تک
جہاں پہنچنا دشوار ہے
جہاں پہنچنے کے خیال سے ہی
تھرا اٹھتی ہے دھرتی

ہاہا کار کر اٹھتی ہے فطرت
توڑ دیتے ہیں
سارے حدود، سارے بندھن
جل، وایو اور اگنی
کسے معلوم کیا دے گا
اور کیوں دے گا اندر پرستھ

اپنا سب کچھ
کیا وہ کچھ سوال نہیں کرے گا
کچھ شرطیں نہیں رکھے گا
ہمارا من دیوانہ یہی کہتا ہے
پہلے تو لے لو جو کچھ اندر پرستھ دے رہا ہے
اندر پرستھ
وہ ہے کہاں؟
وہ ہوگا کہیں نہ کہیں تو
گزرے زمانے میں آج یا
آنے والے کل کے سمئے میں
جسے جیسا پاتے ہیں
جس میں جو جوہر ہے
وہ چمکاتے ہیں
کیا ہے اس کی حقیقت

کیا اندر پرستھ بھی چمکتا ہے
دیکھتے ہیں
پانڈوں کو تھوڑے بہتر
کوروں سے
مہارشی ودھیاس ایسا ہی بتاتے ہیں
ماننی ہی پڑے گی ان کی بات
شاید ان ہی کے ہاتھوں لکھا گیا مہابھارت
ورنہ کون پتا رکھے گا اپنے نونہالوں کا نام
دُریودن اور دوشاسن
پھر کیا مہابھارت کار نے بدل دیا نام

سویودھن اور سوشاسن
دروپدی
جسے نہیں رکھتا تھا وہ سب کچھ
جو دکھتا تھا پنڈتوں کو
لیکن سن لیتا تھا وہ وقت کے قدموں کی چاپ
انہوں نے ہی دیا
پانڈوؤں کو یہ اندھا راج
کیا بٹوارہ دو حصول میں سلطنت کا
اندر پرستھ پانڈوؤں کو
ہستناپور کوروں کو
اندر پرستھ کا راج دیتے سمے
دیئے دو فرمان
پہلے ایک استھان کا نام کھنڈر پرستھ
دوسرا تین مرحومین کے نام
ان ہی فرمانوں کا پالن کرتے ہوئے
پانڈوا اندر پرستھ کو بنائے راجدھانی
پھیلائے راج پاٹ
ہمارے یہاں بھی تو
اندر پرستھ پہنچے کے لیے
ہے یہی سب کچھ
ایک مقام اور تین بزرگوں کے نام

اندر پرستھ کی تاریخ میں
کیسی کیسی گھٹنائیں ہیں
کیسی کیسی بندھنیں ہیں

کیسی کیسی مجبوریاں ہیں
عجیب دیس ہے عجیب نگری
عجیب اس کے بھیس
رنگ روپ الگ الگ
من کے اندر کیا ہے
کون جانے ان جذبات کے کتنے رنگ
نینوں سے بتیاتے رنگ برنگے پنچھی
پت نہیں کس دیس سے آئے ہیں
اندر پرستھ میں
کاش ہمارے بھی پنکھ ہوتے
ہاں خوابوں میں ہم بھی
پنکھ لگا لیتے، بتائیں کیسے
سپنوں کی دنیا میں ہم بھی
اندر لوک گھوم گھوم کر آتے
ساتھ ہمارے ہوا بھی گھوم آتی
یہ کیسی سرگوشیاں
کس کی آواز
کہاں سے آ رہی یہ آواز جانی پہچانی
کون چھو رہا ہے مجھے
بول رہا ہے کوئی
کانوں میں اجنبی بھاشا
سارے تن من میں ڈوب رہی ہیں
سارے بدن میں سنسناہٹ دوڑ رہی ہے
کون چھو رہا ہے مجھے
تکیوں کے بیچ
بڑے بڑے

ہونٹوں سے ہونٹ جڑے ہوئے
رس چوس رہے ہیں
بدن سے بدن
من سے من
چمن ہی چمن
یہ سکھ ہے اندر پرستھ میں

جہاں پانچ بھائیوں نے
ایک ہی استری سے رشتہ باندھا تھا
یہ کیسا رشتہ
یہ کیسا سماج
کیا آج کے سماج سے
الگ ہے یہ سماج
مگر یہ تو مقدس سماج ہے
مگر ہمارے من سے دور نہیں
دروپدی
ایک پوتر استری
جسے کرنا پڑا اسا جا
پانچوں کے بیچ ایک ہی طرح سے
سب کے ساتھ
نبھانا
جھیلنا پڑا
کیسے ہوا ہوگا ممکن
اپنے تن کو بانٹا
تن تو بانٹا ہوگا
لیکن من کو کیسے بانٹے

پانچ شوہروں کو اپنا آپ
پریم، آغوش، امنگیں
یہ سب تو ممکن ہے
مگر ایک ہی کے ساتھ
ایک پریم پجاری کے ساتھ
صرف ایک ارجن کے ساتھ

دیر سے آتا ہے
دور سے آتا ہے
جب آتا ہے تو بس اسی کا سپنا آتا ہے
وہ لیٹ جاتی ہے کہتی ہے
آج کی رات نہ جاؤ
آج کی رات یگوں یگوں کے بعد آئی ہے
آؤ۔ دوڑو میری آغوش میں آجاؤ
رات بھر کی جاگی ہوئی ہوں تمہاری یاد میں
انتظار میں، تمہیں کو چاہا، تم ہی کو مانگا ہے
اب دیر نہ کرو ارجن آؤ جلدی آؤ
کیا تمہیں میری یاد نہیں آتی
کیا تم بھی میری طرح تڑپتے ترستے نہیں ہو
بتاؤ، آ کر بتاؤ
میری بھیگی پلکوں پر اپنا ہاتھ رکھ دو
میرے گالوں پر بہتے ہوئے آنسوؤں کو
اپنے ان پرجوش ہونٹوں سے پی لو
یہ گرم گرم آنسو، ان کی جلن مٹا دو
آج کی رات نہ جاؤ
کچھ دیر تو ٹھہر جاؤ

آؤ میرے جیون میں بہار بن کے
زندگی کا انمول تحفہ بن کے
ایسا پریم ایسی چاہت جواوروں کے لیے ممکن نہیں
کیوں کہ بیاہ تو ہوا تھا پانچ سے
پانچوں کے چہرے تو ارجن کے ہی تھے
جدھر دیکھو ارجن، جسے دیکھو ارجن
ہر جگہ ارجن ہی ارجن
سپنوں میں خیالوں میں سانسوں میں
ارجن ہی ارجن
ان دیکھی خوشبوؤں میں ڈوبی ہوئی دروپدی
پریم کے سمندر میں غوطہ لگاتی دروپدی
میرے من کے سمندر میں پریم کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے
اسے میں سامنے دیکھنا چاہتی ہوں
رات رانی کے پھولوں کی خوشبو
چنبیلی رجنی گندھا کی نرم، خشک ٹھنڈی مہکتی خوشبو
دیکھو بھونرے کی گن گن
کوئل کی کوکو
ارجن بھی تو ایک ہی ناری کا پرستار ہے
دروپدی ہی دروپدی
جہاں دیکھو دروپدی
ارجن بھی تو بے چین ہے
وہ بھی پریم اگن میں
جل رہا ہے پکار رہا ہے
کہاں ہے میری دروپدی، میری دروپدی
دروپدی سنتی ہے یہ پکار
دیکھتی ہے

گنگنانے لگتی ہے
دھیرے دھیرے اپنی مدھر لیے اونچی کرتی ہے
ارجن تک آخر یہ سورگ لہریں پہنچ ہی جاتی ہے
وہ تڑپ جاتا ہے پاگل پاگل
پہنچ جاتا ہے وہاں جہاں اس کا پریم ہے
بانہیں پھیلا کر
ایک دوسرے میں ڈوب جاتے ہیں
ایک ہو جاتے ہیں
ہونٹوں سے ہونٹ ملے
سلگتی سانسوں کی آہٹ میں
ایک دوجے کی خوشو میں
دروپدی کا چاند سا چہرہ ارجن کی بانہوں میں
چھپا ہوا ہے
سب کچھ رُکا رُکا سا
ساری دھرتی سارا آکاش
ساگر، ہوا، چاند سب کچھ خاموش
تبھی کانوں میں داسی کی آواز گونجی
پہلے دھیرے دھیرے پھر تیز، اونچی آواز
ایسا لگا جیسے کوئی پیروں کو پکڑ کر ہلا رہا ہے
دروپدی کی پلکیں کھلیں
داسی کا تھوڑا سا گھبرایا ہوا سا چہرہ دیکھا
جاگئے۔ جاگئے دیوی
دن چڑھے سونے سے خراب خواب آتے ہیں
اٹھئے میں پانی لائی ہوں
آپ کا تو چہرہ مرجھایا ہوا ہے
شریر پسینے میں
بھیگا ہوا ہے
میرے پنکھا جھلنے سے بھی
آپ کو کچھ راحت نہ ملی
دیوی آپ ٹھیک تو ہیں نا
دروپدی کیا بولتی
اپنے میٹھے سپنوں میں کھوئی ہوئی
لجاتی شرماتی رہی

☆☆☆

پس نوشت: جیسا کہ ہم نے شروع میں لکھا تھا یہ شری رویندر کمار کی رزمیہ طویل نظم ''اندر پرستھ'' ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ ہمیں ہمارے اطراف کے ادب میں کیا ہو رہا ہے اس سے بھی واقف ہونے کی ضرورت ہے جتنی ذہن کی کھڑکیاں کھلیں گی اتنی ہی تازہ ہوا آتی ہے روشنی آتی ہے حرارت آتی ہے ہم اردو والے اپنی ہی دنیا میں گم رہتے ہیں سوچا کہ ہندی کے اس شاہکار سے جسے کئی انعامات مل چکے ہیں ہم واقف ہوں مگر اب ہم اسے یہیں ختم کرتے ہیں۔

سب رس

میں صرف **غیر مطبوعہ** مضامین اور

تخلیقات شائع ہوتے ہیں۔

طنز و مزاح

ادیبوں کی جنگِ زرگری

کوئی کچھ بھی کہے لیکن یہ ہماری سوچی سمجھی رائے ہے کہ آج دنیائے ادب میں انیس ناگی جیسا سچا اور کھرا کوئی دوسرا ادیب نہیں ہے۔ جو ان کے دل میں ہوتا ہے، وہ زبان پر اور جو دماغ میں ہوتا ہے زبانِ قلم پر آجاتا ہے اور وہ بھی اس خوب صورتی کے ساتھ کہ دل کے معاملات میں دماغ کو اور دماغ کے معاملات میں دل کو دخل دینے کی اجازت نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ انیس ناگی سچے اور کھرے ہونے کے ساتھ ساتھ کھردرے بھی ہیں۔ دوسروں کے بارے میں رائے دیتے ہوئے وہ کسی مصلحت کو اور اپنے ادبی مقام کا تعین کرتے ہوئے کسی احتیاط کو خاطر میں نہیں لاتے۔ وہ جانتے ہیں کہ مصلحتیں اور احتیاطیں خیالات کے فطری بہاؤ کی راہ میں غیر فطری رکاوٹیں بن جاتی ہیں۔

انیس ناگی ادب کے جس بلند مقام پر فائز ہیں، اس کا اندازہ ان کی کتابوں سے نہیں باتوں سے ہوتا ہے۔ اپنی کتابیں وہ خود چھاپتے ہیں، اس لیے وہ انھیں کے پاس رہتی ہیں لیکن باتیں خوش بو کی طرح عام ہو جاتی ہیں کیوں کہ یہ اخبارات میں شائع ہوتی ہیں۔ لاہور کے اخبارات میں انیس ناگی کے انٹرویو اکثر شائع ہوتے رہتے ہیں جن سے موصوف کی ادبی کارکردگی کا اور معاصر ادیبوں کی کارنا کردگی کا بھرپور اندازہ ہوتا ہے۔ گذشتہ مہینے کے آخری ہفتے میں لاہور کے روزنامہ ''نوائے وقت'' میں ان کا جو انٹرویو شائع ہوا ہے، اس وقت ہمارے سامنے ہے اور اسی کو پڑھ کر ہم لکھنے کی مشق کر رہے ہیں۔

اس انٹرویو کا آغاز ناگی کے اس بیان سے ہوتا ہے ''میں نے لکھنے کی ابتدا شاعری سے کی ہے۔ انسان جب بچہ یا نابالغ ہوتا ہے تو اس پر وفورِ جذبات کا غلبہ ہوتا ہے۔ شاعری اسی جذبے کی پیداوار ہے''۔ کیا حکیمانہ بات ہے جسے سمجھنے والے ہی سمجھ سکتے ہیں۔ نہ سمجھنے والے اس بیان سے کوئی غلط نتیجہ نکال سکتے ہیں اور یہ سوال کر سکتے ہیں کہ شاعری اگر صرف بچوں اور نابالغوں کا کھیل ہے تو بچے بڑے اور بالغ ہو جانے کے بعد بھی شعر کیوں کہتے ہیں؟ انیس ناگی کو کہاں فرصت کہ وہ اس سوال کا جواب دیں، ہمیں کچھ عرض کرتے ہیں۔ بعض بچے بڑے اور بالغ ہو جانے کے بعد بھی بچپن ہی کی فضا میں رہنا پسند کرتے ہیں، اس لیے شعر کہنے کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور اسی لیے شاعروں کو معصوم ترین مخلوق کہا جاتا ہے۔ اردو کے تو ننانوے فی صد شعراء اپنی شاعری کے اعتبار سے خاصے معصوم ہوتے ہیں۔ انھیں تو یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ وہ جو کچھ لکھ رہے ہیں وہ شاعری ہے یا شاعری کی معذرت۔

انیس ناگی جس قسم کی شاعری کرتے ہیں، اس کو تو انھوں نے کوئی نام نہیں دیا لیکن جس قسم کی شاعری وہ نہیں کرتے، اسے وہ ''پابند شاعری'' سے موسوم کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں ''میرے نزدیک پابند شاعری تک بندی کی مشق ہے جس میں قافیے سے قافیہ ملانے پر زور دیا جاتا ہے..... سمجھ میں نہیں آتا کہ آج کے شاعر پابند شاعری کیسے کر لیتے ہیں۔ غزل ایک متروک صنفِ سخن ہے۔ اس میں لکھنا جھک مارنے کے مترادف ہے''۔

یہ باتیں ہمارے دل کو تو لگتی ہیں کیوں کہ میر، غالب اور اقبال وغیرہ نے پابند شاعری ہی میں قافیے سے قافیہ ملا کر تک بندی کی مشق کی ہے یعنی جھک ماری ہے۔ لیکن استاد لاغر مرادآبادی کو انیس ناگی سے اتفاق نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں ''جہاں تک جھک مارنے کا تعلق ہے، نثری نظم اس کام کے لیے زیادہ موزوں ہے کیوں کہ غزل میں جھک مارنے کے لیے بھی تھوڑی بہت محنت تو کرنی ہی پڑتی ہے۔ نثری نظم میں محنت قاری کرتا ہے اور محنت کے رائیگاں جانے کا غم بھی وہی سہتا ہے''۔

انیس ناگی نے اپنے انٹرویو میں صرف احمد ندیم قاسمی کا ذکر اچھے لفظوں میں کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آج کل قاسمی صاحب کا ستارہ عروج پر ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انیس ناگی، بادل ناخواستہ سہی، کبھی کبھی کسی کے بارے میں اچھی رائے قایم کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔ ورنہ زیرِ نظر انٹرویو میں ان کے ناوک نازنے زمانے میں کوئی صید نہیں چھوڑا، یہاں تک کہ مولانا حالی اور فیض کو اوسط درجے کے شاعر قرار دیا ہے۔ قتیل شفائی کو فلمی شاعر کہہ کر ان کے ادبی مقام کی نفی کی ہے۔ انتظار حسین کے بارے میں کہا ہے کہ وہ چالیس برس سے ایک ہی نقطے پر جمے ہوئے ہیں۔ افتخار جالب اور انور سجاد کے متعلق یہ اطلاع دی ہے کہ دونوں زر کی تلاش میں ادب کو چھوڑ گئے ہیں۔ مجید امجد کے مجموعہ کلام ''شبِ رفتہ'' کو بہت کمزور مجموعہ بتایا ہے۔ مشتاق احمد یوسفی پر الزام لگایا ہے کہ وہ لغت پر انحصار کرتے ہیں۔ انیس ناگی یہی الزام انتظار حسین پر بھی لگا چکے ہیں۔ ہمیں تو اس میں کوئی برائی نظر نہیں آتی، اگر کوئی لکھنے والا ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے جن کے معنی پڑھنے والے کو معلوم نہیں ہیں تو اسے بھی لغت پر انحصار کرنا چاہیے۔ جس لفظ کے معنی معلوم نہ ہوں، لغت میں دیکھ لینے چاہئیں۔ ویسے ہم مشتاق احمد یوسفی اور انتظار حسین کو مشورہ دیں گے کہ وہ آئندہ جب کوئی کتاب لکھیں تو اس کے ساتھ فرہنگ بھی لگا دیا کریں تا کہ انیس ناگی کی شکایت رفع ہو جائے۔ شاید مشکل الفاظ ہی کی وجہ سے انیس ناگی کو میر کے ہاں بھرتی کے اشعار زیادہ نظر آتے ہیں۔ ''فرہنگ میر'' کتابی صورت میں شائع ہو چکی ہیں، شاید موصوف کی نظر سے نہیں گزری ورنہ بھرتی کے شعروں کی تعداد میں معقول حد تک کمی ہو سکتی تھی۔

انیس ناگی نے تنقید نگاروں کے بھی خوب لتّے لیے ہیں۔ اس پر انٹرویو لینے والے نے کہا ''اس کا مطلب یہ ہوا کہ سوائے انیس ناگی کے کوئی تنقید نہیں لکھ رہا'' موصوف نے اس کا جواب یہ دیا ''میں نے بھی تنقید لکھنی چھوڑ دی ہے، اس لیے کہ جب میں اپنی غیر جانب دارانہ آرا کا اظہار کرتا ہوں تو لوگ مرنے مارنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ تنقید لکھنے پر کشور ناہید نے میرا تبادلہ لاہور سے ملتان کروا دیا تھا۔ آپ خود ہی بتائیں میں تنقید کیسے لکھوں، اب میں بوڑھا ہو چکا ہوں اور دھمکیوں کا مقابلہ کرنے کی سکت نہیں رہی''۔

ہمیں یہ تکلیف دہ صورت حال معلوم نہیں تھی۔ ہم انیس ناگی کو مشورہ دیں گے کہ وہ تنقید سے ہمیشہ کے لیے تائب نہ ہوں، بس ذرا اتنی احتیاط کریں کہ پیپلز پارٹی کے دور اقتدار میں تنقید لکھنے سے پرہیز کریں تا کہ کشور ناہید ان کو پریشان نہ کر سکیں۔ مسلم لیگ کا یا مارشل لا کر دور اس کام کے لیے بہت موزوں ہے کیوں کہ ان ادوار میں خود کشور ناہید کو پے در پے تبادلوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ویسے سننے میں آیا ہے کہ اب کشور ناہید کسی سے ناخوش ہوتی ہیں تو اس کا تبادلہ نہیں کرواتیں، بلکہ یہ دھمکی دیتی ہیں کہ اگر تم راہ راست پر نہ آئے تو اپنی آپ بیتی کے اگلے ایڈیشن میں تمھارا ذکر بھی کروں گی۔

انیس ناگی اکادمی ادبیات سے بھی ناخوش ہیں، انھیں شکایت ہے کہ ''اکادمی کی اہل قلم کانفرنس عجب ہڑبونگ کا شکار تھی، شرکا کی آدھی تعداد سرے سے ادیب ہی نہ تھی، اس کانفرنس کا مقصد محض اپنے دوستوں کو انعاموں سے نوازنا تھا اور یہ انعامات جی بھر کے غیر مستحقین کو دیئے گئے اور اس پر جو احتجاج کیا گیا اسے بھی نظر انداز کر دیا گیا''۔

انیس ناگی نے اگرچہ یہ نہیں بتایا کہ وہ اہلِ قلم کانفرنس کے شرکا کی کس آدھی تعداد میں شامل تھے، مگر ان کے اعتراضات بالکل درست ہیں۔ اکادمی کو ان شکایات کا ازالہ کرنا چاہیے اور دوستوں سے انعامات واپس لے کر دشمنوں میں تقسیم کر دینے چاہئیں تا کہ دشمنوں کا شمار بھی دوستوں میں ہونے لگے۔ اب دوستی اور دشمنی کا انحصار ایسی ہی باتوں پر رہ گیا ہے۔

انیس ناگی نے اس پر اظہار افسوس کیا ہے کہ اس سال ایک ایسے ادیب کو پرائڈ آف پرفارمنس ملا ہے جس نے گزشتہ تیس

برسوں سے کچھ نہیں لکھا۔ معلوم نہیں اس میں افسوس کی کیا بات ہے، کیوں کہ یہ اعزاز تو ملا ہی نہ لکھنے کی وجہ سے ہے۔ اگر کوئی ادیب انیس ناگی کی طرح لکھ لکھ کر ڈھیر لگاتا رہے تو اسے کون اعزاز کے لائق سمجھے گا۔

آخر میں انیس ناگی کا ایک دردناک بیان: ''بہت سے ناول نگار مجھے ناول نگار نہیں مانتے، اسی طرح شاعر مجھے ناشاعر کہتے ہیں، آپ سے کس نے کہا کہ میں اہم ادیب ہوں، مجھے ابھی تک سرکار کی طرف سے کوئی انعام نہیں ملا، اکادمی ادبیات نے کبھی باہر کی سیر نہیں کرائی، حکومت نے کوئی اچھا عہدہ نہیں دیا، ہر قسم کی ادبی اور ثقافتی تنظیموں سے مجھے باہر رکھا گیا، ان تمام باتوں کا مطلب یہ ہے کہ میں اہم ادیب نہیں ہوں۔ البتہ ناپسندیدہ ضرور ہوں، صرف اس لیے کہ ایک خوشامد پرست عہد میں ایک نئے ضمیر کی داستان مرتب کر رہا ہوں..... میں اپنے آپ کو ضلعی سطح کا ادیب سمجھتا ہوں''۔

شاید کسی ایسی ہی صورت حال سے دل برداشتہ ہو کر منیر شکوہ آبادی نے کہا تھا:

میرے ہنر کا کوئی نہیں قدرداں منیرؔ
شرمندہ ہوں میں اپنے کمالوں کے سامنے

(۱۹/اکتوبر ۱۹۹۵ء)

مجتبیٰ حسین کے بارے میں دو ضخیم کتابیں شائع

فن اور شخصیت پر ممتاز اہل قلم کی تحریریں

بین الاقوامی شہرت یافتہ طنز و مزاح نگار مجتبیٰ حسین کی ادبی زندگی کے پچاس سال مکمل ہونے پر ملک کے نامور پبلشر ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤز دہلی نے مجتبیٰ حسین کی شخصیت اور فن پر دو نہایت مبسوط کتابیں شائع کی ہیں جن کے نام ہیں ''مجتبیٰ حسین: جیسا دیکھا جیسا پایا'' اور ''مجتبیٰ حسین آئینوں کے بیچ''، ''مجتبیٰ حسین جیسا دیکھا جیسا پایا'' میں اس نامور ادیب کی شخصیت کے مختلف رنگا رنگ پہلوؤں پر ملک اور بیرون ملک کے مشہور اہل قلم کے نہایت دلچسپ تاثراتی مضامین شامل ہیں۔ یہ مضامین مختلف اوقات میں لکھے گئے تھے۔ پروفیسر وحید اختر، پروفیسر گوپی چند نارنگ، خواجہ حسن ثانی نظامی، مشفق خواجہ، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، انتظار حسین، پروفیسر شمیم حنفی، فکر تونسوی، پروفیسر نثار احمد فاروقی، ڈاکٹر شہریار، یوسف ناظم، مرزا ظفر الحسن، پروفیسر یوسف سرمست، رفعت سروش، پروفیسر بیگ احساس، دلیپ سنگھ، نریندر لوتھر، علی باقر، کے ایل نارنگ ساقی اور کئی دوسرے اہم ادیبوں نے اپنے انداز میں مجتبیٰ حسین کو ''جیسا دیکھا جیسا پایا'' کے تحت اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ کئی شعراء نے منظوم خراج تحسین بھی پیش کیا ہے۔ انگریزی میں صاحب طرز ادیب خوشونت سنگھ، محمد علی صدیقی، علی باقر، عارف حسینی، بلراج ورما اور نقی علی کے سیر حاصل مضامین شامل ہیں۔ ''مجتبیٰ حسین آئینوں کے بیچ'' مجتبیٰ حسین کے فن کا جائزہ ہے۔ اردو کا شاید ہی کوئی ایسا اہم ناقد رہا ہو جو اس منفرد طنز و مزاح نگار کے فن سے متاثر نہ ہوا ہو۔ پروفیسر آل احمد سرور، شمس الرحمٰن فاروقی، صدیق الرحمٰن قدوائی، ڈاکٹر قمر رئیس، جاپانی پروفیسر سوزوکی تاکیشی، پروفیسر مغنی تبسم، ڈاکٹر عتیق اللہ، ڈاکٹر مصطفیٰ کمال، رضیہ فصیح احمد، مصحف اقبال توصیفی، ڈاکٹر اشفاق احمد ورک، علی ظہیر، حسن چشتی، ڈاکٹر افسر کاظمی، زاہد علی خاں، من موہن تلخ، انور سدید، مخمور سعیدی، ڈاکٹر مظفر حنفی، علیم صبا نویدی، قمر علی عباسی، مظہر امام اور کئی دوسرے نقادوں نے مجتبیٰ حسین کے فن کا جائزہ لیا ہے۔ مجتبیٰ حسین کے فن کے بارے میں بے باکانہ انٹرویوز ایک مستقل باب کی حیثیت رکھتے ہیں جن میں زبیر رضوی، کمار پاشی، رشید انصاری، حامد اکمل، طاہر مسعود، فیروز عالم، حلیمہ فردوس اور کئی باریک بیں اصحاب کے نام آپ کو ملیں گے۔ دونوں کتابیں اہم اور یادگار تصاویر سے مزین ہیں۔ کتابت طباعت نہایت دیدہ زیب ہے۔ ان دونوں کتابوں کو سید امتیاز الدین اور محمد تقی نے مرتب کیا ہے۔ ہر کتاب کی قیمت ساڑھے چار سو روپے رکھی گئی ہے۔ ان کتابوں کو ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس 3108 وکیل اسٹریٹ، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی 6 اور ملک کے اہم بک اسٹالوں سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

شاعری

غزلیں

پی پی سریواستورند

مسلم نواز

مستقل دھوپ میں اک عمر کا جاگا، وہ شخص
آج صدیوں کی تھکن اوڑھ کے سویا، وہ شخص

اجلے خوابوں کو لیے، گاؤں سے ہجرت کی تھی
شہر میں ہار گیا اپنی ہی دنیا 'وہ شخص

گھر کی دیوار کو اب پکڑے ہوئے چلتا ہے
ٹھوکروں میں تھا کبھی جس کے زمانا ،وہ شخص

جو کبھی اونچی کلاہیوں پہ کبھی نازاں تھا
بن گیا اپنی ہی بستی میں تماشا، وہ شخص

گھر کی کھونٹی پہ ٹنگے وقت نے آنکھیں کھولیں
آج سنانے میں اس زور سے چیخا، وہ شخص

اب تو ہجرت کے لیے دوسرا جنگل بھی نہیں
یاد آیا جو قبیلہ بہت رویا، وہ شخص

رنؔد مرگھٹ تھا کہ شمشان تھاسارا ماحول
کب تلک جسم کے تابوت کو دھوتا وہ شخص

اس کی آنکھوں میں سمندر کے سمندر ڈوبے
ہم بھی تیراک تھے کچھ سوچ سمجھ کر ڈوبے

سر جو سجدے میں جھکایا تو اٹھا یا نہ گیا
جس طرح اپنی ریاضت میں قلندر ڈوبے

تھی تمنا کہ انہیں اپنا بنائے رکھوں
پہلے آنکھوں میں بسے دل میں اتر کر ڈوبے

پھر عدالت کو گواہی کی ضرورت ہی نہیں
اپنے ہی خون میں جب اپنے ہی خنجر ڈوبے

نا خدائی پہ ہماری نہ کوئی آنچ آئے
ہم تو ڈوبے تھے مگر سب کو بچا کر ڈوبے

ایک فرعون سے کیوں خوف زدہ ہے مسلؔم
کتنے فرعونوں کے اس بحر میں لشکر ڈوبے

غزلیں

مصداق اعظمی

تری گلی میں نہیں نقشِ پا میں کانپتا ہے
ہمارا عزم تو راہِ خدا میں کانپتا ہے

ہمیں الگ نہ کرو درد کی کہانی سے
ہمارا شعر بھی ذکرِ وفا میں کانپتا ہے

وہ میری چھت پہ ہو یا ہو مری ہتھیلی پہ
مرا چراغ مری جاں ہوا میں کانپتا ہے

خدا قریب سے سننے پہ ہو گیا راضی
ہمارا ہاتھ مسلسل دعا میں کانپتا ہے

ہمارے عہد میں منصوبۂ تعصب بھی
بہ نامِ امن ہی چارو دشا میں کانپتا ہے

یہ سلطنت تو کسی اور کے حوالے کر
ترا خیال تو ظلِ ہما ہی کانپتا ہے

بہت امیر بھی ہر سال کے دسمبر میں
کسی غریب سے چھپ کر ردا میں کانپتا ہے

اسے پتہ نہیں مکڑی کے جال کا قصہ
وہ آدمی جو مسلح گفا میں کانپتا ہے

یہ سچ ہے آب و ہوا کے بغیر مرجائے
تمام شہر خدا کے بغیر مر جائے
نظامِ عمل وہ قائم کرو کہ گھبرا کر
گناہ گار سزا کے بغیر مر جائے
یہی تو میرؔ نے غالبؔ نے داغؔ نے سوچا
سخن مرا نہ صدا کے بغیر مر جائے
پیامبر تو نہیں ہے یہ آدمی صاحب
خوشی خوشی جو خطا کے بغیر مر جائے
سخن کے نام پر عریانیت کا کیا مطلب
مری غزل تو ردا کے بغیر مر جائے
میں چاہتا ہوں تعصب پرست لوگوں کا
فقیہ آج دعا کے بغیر مر جائے
کسی غریب کی خاطر امیر کی بیٹی
کبھی تو رنگِ حنا کے بغیر مر جائے
کوئی مرضی نہیں یونہی ایک دن مصداقؔ
مسیح وقت دوا کے بغیر مر جائے

غزلیں

ہارون شامی

بات نکلی ہے تو یہ بات مجھے کہنے دو
زندگی لے لو مگر حرفِ دعا رہنے دو

آگ لگ جائے گی رو کو گے اگر اشکِ رواں
بے گناہوں کے یہ آنسو ہیں انہیں بہنے دو

آستینوں پہ لگے خون کے چھینٹے دھولو
میرے سینے میں جو خنجر ہے اسے رہنے دو

دولتیں سارے زمانے کی مبارک ہوں تمہیں
میرے حصے میں خلوصِ دل و جاں رہنے دو

ہم زمانے کی زبوں حالی پہ لکھیں گے غزل
لوگ کہتے ہیں قصیدہ تو انہیں کہنے دو

فاصلے اتنے نہ بڑھ جائیں کہ طے ہو نہ سکیں
راہ دشوار سہی، عزمِ سفر رہنے دو

کیا پتہ کوئی مجھے ڈھونڈنے آئے شامؔی
اس خرابے میں مرا نام و نشاں رہنے دو

مدت ہوئی نکلے ہوئے خوابوں کے سفر میں
اب دیکھئے کب آتا ہوں میں لوٹ کے گھر میں

آنے کی مسرت ہے، نہ جانے کا کوئی غم
مہماں کی طرح رہتا ہوں میں اپنے ہی گھر میں

دنیا کی نظر میں وہ فقط اشکِ رواں تھا
کچھ خواب بھی شامل تھے مگر دیدۂ تر میں

حیرت سے مجھے دیکھ رہے تھے مرے اپنے
جیسے چلا آیا تھا کسی اور کے گھر میں

کہتے تھے کہ سائے کی طرح ساتھ رہیں گے
افسوس وہی چھوڑ گئے مجھ کو سفر میں

اٹھتی ہی نہیں اس کی نظر اب سرِ محفل
وہ شخص کہ گر جاتا ہے جو اپنی نظر میں

میں نے جو کہا تھا وہ کسی نے نہیں لکھا
لیکن جو کہا بھی نہیں شامل ہے خبر میں

افسوس کہ پہچان نہ پایا کوئی شامی
شامل تھا مرا نام کبھی اہل نظر میں

شاعری

غزلیں

بدر محمدی

لب، حلق، زباں اور نہ تالو کے حوالے
ہر لفظ مرے شعر کا اردو کے حوالے

وہ کھولتا ہے شام ڈھلے اپنی حقیقت
قدرت نے کی ہے روشنی جگنو کے حوالے

شیشے کی طرح عکسِ نظر ٹوٹ نہ جائے
اک آئینہ خانہ ہے من و تو کے حوالے

ہے مجھ کو خبر دھوپ کی، ہوں چھاؤں سے واقف
نظریں ہیں مری عارض و گیسو کے حوالے

حیران نظر آتا نہیں کوئی کسی کو
ہر شخص ہوا جاتا ہے جادو کے حوالے

سکّے کی طرح مجھ کو اچھا لو کہ میں دیکھوں
قسمت ہے مری کون سے پہلو کے حوالے

اسلوبِ معطّر ہے اسے بدؔر میسر
گلہائے ہنر سے جو دے خوشبو کے حوالے

بانٹنے والوں نے جب اپنا پرایا بانٹا
بھائی نے بھائی سے دیوار کا سایہ بانٹا

ساز و سامان کی تقسیم نئی بات نہیں
میرے اپنوں نے ٹھہرنے کا کرایہ بانٹا

بانٹنے والوں سے کی ساری کمائی اس نے
میں نے جو بانٹا وہ سب اپنا کمایا بانٹا

جائیداد اس کی کہاں پھر بھی سلیقے سے بٹی
گو کہ لوگوں نے اسے حسب و صایا پہ بانٹا

بانٹ پایا نہ اندھیرا مرے تن کو اب تک
وہ اجالا ہے کہ جس نے مرا سایہ بانٹا

اب بھی پھیلائے ہوئے دست طلب ہیں کتنے
تو نے کیا کیا نہ زمانے میں خدایا بانٹا

تجربہ بہرِ سخن راس جو آیا تجھ کو
تو نے اے بدؔر اسے جمع کیا یا بانٹا

شاعری

غزلیں

انورادیب

مرے گماں کو ابھی اعتبار ہونا ہے
کہ جو ہوا نہیں وہ ایک بار ہونا ہے

زبان ڈرنے لگی ہے کلام کرنے سے
نگاہ و چشم کو ہی حرف بار ہونا ہے

میں راہگیر ہوں میرے لیے ہدایت ہے
کہ مجھ کو خاک سر رہگزار ہونا ہے

گزر ہی جائیں گے یہ شعلہ بار موسم
امید کا ہے شجر برگ و بار ہونا ہے

وفا کی تم سے توقع نہیں مگر پھر بھی
یہ جان و دل تو تمہیں پر نثار ہونا ہے

ترے خیال کی گرمی سے تپ رہا تھا یہ دل
میں جانتا تھا اسے شعلہ بار ہونا ہے

وفا شعارئ فطرت ہوئی ہے بے معنی
تمہیں ادیبؔ زمانہ شعار ہونا ہے

ہم یوں ہی ٹوٹتے بکھرتے رہے
شکر ادا کرنا تھا سو کرتے رہے

نہ وہ دریا نہ وہ سراب ہی تھا
ہم کہاں ڈوبتے ابھرتے رہے

ایک تم تک ہمیں پہنچنا تھا
کن جہانوں سے ہم گزرتے رہے

زندگی بدنما سی تھی تصویر
عمر بھر اس میں رنگ بھرتے رہے

صاف گوئی ہماری فطرت تھی
ہم سدا صاف بات کرتے رہے

بات آنکھوں سے ہو گئی ظاہر
ہم عبث ہی مگر مکرتے رہے

زندگی بھر نہ طے ہوا انورؔ
ہم کہ زندہ رہے کہ مرتے رہے

شاعری

غزلیں

احمد نثار

اگر دہشت زدہ کوئی نہیں ہے
شکستہ آئینہ کوئی نہیں ہے

سبھی ہیں منکشف اک دوسرے پر
کسی سے بولتا کوئی نہیں ہے

حسینی مرتبہ کے سب ہیں خواہاں
شریکِ کربلا کوئی نہیں ہے

کھلا ہے ذہن ہی آٹھوں پہر اب
دریچہ دوسرا کوئی نہیں ہے

رکا اس موڑ پر میں ہوں نثؔار اب
جہاں سے راستہ کوئی نہیں ہے

زندگی میں نئی سحر آئے
یہ دعا ہم بھی آج کر آئے
خوف کے سائے ہر سو پھیلے ہیں
ہم فلک سے کہاں اُتر آئے
آج بھی میرے دل میں حسرت ہے
تو مخالف مرا نظر آئے
ٹاٹ کے جن کے گھر میں پردے ہیں
آج سلطان ان کے در آئے
پھر سلوک اس کا ہے یزیدانہ
چہرۂ آب ہی نظر آئے
اس نے غیرت سے توڑ دی تلوار
ہم ہتھیلی پہ لیکے سر آئے
لوگ بھکتیں گے اس کا خمیازہ
سارے موسم ہی بے ثمر آئے
مجھ سے لپٹی ہوئی تھی تنہائی
خواب میں تم دمِ سحر آئے
جان تجھ پر نثؔار کرتا ہوں
کوئی آفت ہو میرے سر آئے

غزلیں

ابرار نغمی

بنتا رہا ہوں خود سے ہی مٹتا رہا ہوں میں
مثلِ حُباب و موجۂ دریا رہا ہوں میں

نہ چشم تر نہ حرفِ تمنا رہا ہوں میں
شہرِ وفا میں اس پہ بھی رسوا رہا ہوں میں

نازاں ہوں اپنے حالِ شکستہ کے باوجود
اس حسنِ بے مثال کی دنیا رہا ہوں میں

مدّت ہوئی اٹھی تھی مری سمت چشمِ ناز
مثل چراغ شام سے جلتا رہا ہوں میں

حیرت اگر جہاں کو ہے مجھ پر تو کیا عجب
اک عمر شہر سنگ میں جیتا رہا ہوں میں

شاید کہ ربطِ خاص ہے مجھ سے تنہائی کو
سو آئینوں کے بیچ بھی تنہا رہا ہوں میں

آساں تھی مجھ کو گردشِ غمہائے روز گار
نغمی شکار جلوہ و پردا رہا ہوں میں

نفس نفس مضطرب رہا ہوں قدم قدم منتشر رہا ہوں
بہ ایں ہمہ گردشِ زمانہ کسی کا میں منتظر رہا ہوں

اس عہد صبر آزما میں بھی ہے فروزاں شمع ضمیر میری
مسافتِ تیر گئی شب سفیر نور سحر رہا ہوں

بس اک تجلی سے اٹھ گئی ہیں قیود ہوش اور آگہی سب
حدودِ فکر و نظر سے آگے کہاں کہاں سے گزر رہا ہوں

کبھی حوادث نے ڈگمگایا کبھی سلاسل نے آزمایا
مگر نہ کم جہد زندگی ہے نہ دل سے ہی بے خبر رہا ہوں

نہ جستجو میں کوئی کمی ہے نہ آرزو ہی بجھی بجھی ہے
ہزار طوفانِ غم نے روکا مگر میں گرم سفر رہا ہوں

وہ نامراد طمانیت ہوں خلش رہی جس کے دل میں نغمی
کبھی گرفتار دل رہا ہوں کبھی شکار نظر رہا ہوں

افسانہ

حادثہ-2

جنوری2015 کے شمارے میں صفحہ 16پر بلراج بخشی کا افسانہ 'حادثہ' شائع ہوا تھا۔'حادثہ' میں نذیر ایک پیشہ ور بس ڈرائیور ہے اور اپنے بچوں کی مزید پڑھائی کے لئے اسے بہت سے پیسوں کی ضرورت پڑتی ہے جس کا انتظام نہیں ہو پاتا۔اچانک اسے گاڑی کے انشورنس اور کسی بھی ڈرائیور کی حادثاتی موت پر حکومت کی طرف سے ex gratia امداد کا خیال آتا ہے اور وہ سواریوں سے بھری ہوئی بس کا ایکسیڈنٹ کرنے فیصلہ کر کے گاڑی کو تیز تر رفتار میں کرنے لگتا ہے۔ پھر عین اس وقت جب جب وہ گاڑی کو دوڈھائی سو فٹ گہری کھائی میں گرانے لگتا ہے، سڑک کیا یک جانب سے سڑک کی دوسری جانب اچانک چھلانگ لگانے والے ایک خرگوش کو بچانے کے چکر میں وہ گاڑی کو بڑی ہوشیاری کے ساتھ سڑک کی ایک طرف کھڑا کرتا ہے۔سڑک کے کنارے بنے پشتے سے ٹکرا کر گاڑی تو کھڑی ہو جاتی ہے لیکن جھٹکے سے ڈرائیونگ سائڈ کی کھڑکی کھل جاتی ہے اور وہ اچھل کر کھڑکی میں سے اڑتا ہوا سینکڑوں فٹ کھائی میں گر جاتا ہے۔خرگوش اور سواریاں بچ جاتی ہیں۔'حادثہ-2'اسی کا sequel ہے)

نذیر کو نہ تو وقت کا احساس رہ گیا تھا، نہ ہی وجود کا۔اس وقت تو یوں لگتا تھا کہ شاید وہ ابتدائے آفرینش کی خلائے بسیط میں کوئی دھڑکتا ہوا بلبلۂ شعور تھا جو لحہ بہ لحہ کائنات کی پھیلنے والی بیکرانی کا امکان بن جائے گا۔دراصل شعور صرف وجود کا اعتراف ہے جو احساس سے بہت پہلے کا مرحلہ ہوتا ہے؛ جبکہ وجود احساس کا زائیدہ ہے۔نذیر کی آنکھیں بند تھیں اور ابھی تک اس کے شعور کی رو بھی خوابیدہ ہی تھی۔اس کا جسم رہ رہ کر ایک مسلسل مذبوحی تشنج کے زیر اثر تھرتھرانے لگتا تھا۔لاشعور سے شعور تک کا فاصلہ نہ جانے اس نے کتنے قرنوں میں طے کیا۔اور پھر اسے رفتہ رفتہ اپنے وجود کا ادراک تو ہونے لگا لیکن وہ ابھی تک احساس سے ماورا تھا کہ جیسے نشے کی گہری ڈوز کے زیر اثر ہو۔بس اسے اس بات کا احساس ہونے لگا تھا کہ وہ کائنات کی رگوں میں رواں کوئی حرکی روح ہے ،کوئی جامد شے نہیں۔

بڑی دیر بعد اسے صرف یہ احساس ہوا کہ وہ دُکھوں کا کوئی اجتماع ہے جسے شاید وجود اور عدم وجود کے درمیانی وقفے کے لیے مجسم درد کی علامت کے طور پر تخلیق کیا گیا ہوگا اور شاید یہ درد کی شدت ہی کا احساس تھا کہ نذیر کی آنکھیں کھل رہی تھیں اور وہ آہستہ آہستہ اپنے وجود سے باخبر ہونے لگا تھا۔اب اسے غیر محسوس مدت کے لیے ویسے ہی پڑا رہ کر اپنے ذی روح ہونے کا اطمینان حاصل ہو رہا تھا۔اب وہ کھلی آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھنے کے اہل ہونے لگا تھا۔

نذیر کی آنکھیں تو کھل گئیں مگر اس کے حواس خمسہ اس طرح بیدار نہیں ہوئے تھے کہ وہ اردگرد کی دوسری چیزوں سے اپنی جداگانہ حیثیت کا تعین کر سکتا یا اپنے قرب و جوار کا امتیازی جائزہ لے کر کے اپنے وجود کو کوئی معنی پہنا سکتا۔لہٰذا اس کی آنکھوں نے آہستہ آہستہ ڈھیلے گھمانے پر ہی اکتفا کیا لیکن جو کچھ دکھائی دیا وہ سمجھ میں نہ آنے والا ہی تھا۔اسے آہستہ آہستہ احساس ہوا کہ وہ نسبتاً کسی اونچی جگہ پر معلق ہے اور اس کے نیچے گہرائی میں ایک کھائی ہے جس میں کہیں کہیں پانی کی چمک کسی زیر زمین چشمے کی موجودگی کا عندیہ دے رہی تھی۔لیکن وہ خود کہاں ہے؟

یقینی طور پر اس میں اس کی شعوری کارفرمائی کا دخل نہ رہا ہوگا اور کسی خودکار جبلی مدافعتی نظام نے ہی اسے بہت دیر تک

بے حرکت رکھا ہوگا کیونکہ جس محل وقوع میں وہ اس وقت تھا، وہاں سے ذرا سی اضطراری حرکت بھی اس کا توازن بگاڑ کر تیس چالیس فٹ گہرے میں گرا کر اس کا خاتمہ کر سکتی تھی۔ اور پھر بہت دیر بعد نذیر کو احساس ہونے لگا کہ وہ ایک تیکھی ڈھلوان پر ایک خاردار گھنی جھاڑی کی پناہ میں ہے۔ اس نے ہلنے کی کوشش کی اور اس کے جسم میں لاتعداد مزید کانٹے چبھنے لگے۔ اسے آہستہ آہستہ احساس ہوا کہ وہ ایک زندہ انسان ہے اور اس کا سارا جسم ایک دکھتا ہوا پھوڑا بن گیا ہے۔ لیکن میں یہاں آیا کیسے؟ اسے کچھ بھی یاد نہ آیا۔ اسے کچھ آوازیں قریب آتی ہوئی سنائی دینے لگیں:

'ضروری نہیں کہ لاش مل ہی جائے..... یہ نندنی کی رکھ ہے.... کئی برسوں سے یہاں شکار پر پابندی ہے.... اور اب تو یہاں چیتے بھی دیکھے جا رہے ہیں....'

'پھر بھی....'۔ دوسری آواز آئی، '.... بچی کھچی ہڈیاں تو مل جاتیں....'

'یہ بھی ضروری نہیں.... چیتے جیسے شکاری جانور اپنے شکار کو اسی وقت نہیں کھا جاتے.... وہ اسے کسی محفوظ مقام پر لے جاتے ہیں جہاں کوئی ان کے کھانے میں خلل انداز نہ ہو سکے....'

آوازیں آہستہ آہستہ دُور ہوتی گئیں۔

لیکن نذیر ان باتوں کو کوئی معنی نہ پہنا سکا۔ گاڑی کے ڈرائیونگ کیبن سے ہوا میں اچھل کر کھائی کی ڈھلوان میں تقریباً سو فٹ تک پتھروں اور چٹانوں پر غیر ارادی طور پر گھسٹتے ہوئے پھسلنا کسی زندہ جسم کے ساتھ کیا کیا کر سکتا ہے اس کا تصور بھی مشکل ہے۔ تھکان کے ازالے اور توانائی کی واپسی کے لیے جسم نیند کا سہارا لیتا ہے لیکن نذیر کے جسم کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کا ازالہ نیند بھی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ پھر طویل بے ہوشی کی آغوش میں چلا گیا تھا کیونکہ بے ہوشی کی طوالت ہی جسم کے خودکار مرمتی نظام کو توانائی کی واپسی کا موقع فراہم کر سکتی تھی۔

اگلی بار جب نذیر کو ہوش آیا تو آفتاب کی تمازت سکون بخش لگ رہی تھی۔ اس کے جسم کا خودکار مدافعتی نظام جسم کو ہوئے نقصان کی جو بھرپائی کر سکتا تھا کر چکا تھا اور اب جسم کو خود ہی اپنے لیے اضافی حفاظتی کاروائی کے لیے فعال ہونا پڑے گا۔ جسم پر لٹکتے ہوئے چیتھڑوں کو جھاڑی کے کانٹوں سے الگ کرنا آسان نہیں تھا۔ مشکل ہی سے کوئی حصہ بچا ہوگا جو نوکیلے کانٹوں کی دست برد سے محفوظ تھا۔ لیکن کانٹوں سے گلوخلاصی کے مرحلے سے نکلنے کے بعد بڑا مسئلہ نیچے اترنے کا تھا۔ ڈھلوان کے اوپر چڑھنا تو خیر ناممکن تھا، نیچے اترنا بھی آسان نہیں تھا۔ کھڑی ڈھلان جس پر پکڑنے کے لیے شاید ہی کچھ ہو، سے نیچے اترنا تن بہ تقدیر ہو جانے کے برابر تھا۔ خود کو پھسلنے سے روکنے کے لیے کہیں کہیں ابھری ہوئی چٹانیں تھیں جن کے ساتھ جسم کا کون سا حصہ کس رفتار سے ٹکرائے گا، اس کی پیشگوئی بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔

کچھ اسی انداز سے گرتے پھسلتے نذیر نیچے پہنچا تو بہت دیر تک ہانپتے ہوئے پڑا رہا۔ کئی جگہوں سے کھال اُدھڑ گئی تھی اور تازہ خون رسنے لگا تھا۔ وہ بہت دیر تک آنکھیں بند کیے یونہی بے حس و حرکت پڑا رہا۔ پھر جب کوئی چیختی ہوئی کریہہ چیخ آنکھیں کھلنے کا باعث بنی تو کچھ فاصلے پر ایک ٹھنٹھ پر چیل کو چنگھاڑتے ہوئے پایا۔ چیل کی چمکتی ہوئی زرد آنکھیں اسے گھور رہی تھیں۔ نذیر نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن محض ہل کر رہ گیا۔ لیکن اس کے جسم کی حرکت میں زندگی کے آثار دیکھ کر چیل ٹھنٹھ سے اُڑا اور ہوا میں دو چکر لگانے کے بعد جب اسے یقین ہو گیا کہ وہ اس کے لئے دوپہر کا کھانا نہیں بن سکتا تو وہ فیصلہ کن انداز میں ایک سمت میں اوجھل ہو گیا۔

نذیر لیٹے لیٹے ہی گھسٹ کر پاس بہتے ہوئے پانی کے پاس پہنچا اور کسی چوپائے کی طرح منہ سے ہی پینے لگا۔ شفاف ٹھنڈا پانی منہ کے اندر جاتے ہی جسم میں ایک خوشگوار احساس جاگنے لگا۔ اس نے

سیر ہوکر پانی پیا اور پھر اٹھ کر اُکڑوں بیٹھ گیا۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے پانی ہتھیلیوں میں لے کر منہ پر دو تین چھینٹے مارے اور لڑکھڑاتے ہوئے اٹھ کر ایک جانب چلنے کی کوشش کرنے لگا۔ نقاہت سے اس کا برا حال تھا۔ سارا جسم ایک درد زار بن گیا تھا۔

اس نے ذہن پر بہت زور دیا لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کون تھا اور یہاں کیا کر رہا تھا بلکہ یہاں کیسے پہنچا تھا۔ وہ یوں ہی چل رہا تھا۔ بے مقصد۔ لیکن چلتے وقت اسے کوئی دقت نہیں ہو رہی تھی اور صاف طور پر اس کا مطلب یہ تھا کہ اس کی ہڈیوں اور جوڑوں کو کوئی گزند نہیں پہنچی تھی۔ گو کہ پانی سے ہی اس میں کچھ توانائی عود کر آئی تھی لیکن بھوک چمک اٹھی تھی۔ کھانے کی کسی چیز کی تلاش میں اس نے آس پاس دیکھا مگر کچھ نظر نہ آیا۔ کہیں کہیں جھڑ بیری کی جھاڑیاں تھیں جن پر وافر تعداد میں سرخ رنگ کے بیر لگے ہوئے تھے مگر اس کی حافظے میں یہ اطلاع محفوظ نہیں تھی کہ جھڑ بیری کے پھل کھائے جا سکتے ہیں یا نہیں۔ اگر زہریلے نکلے تو؟

اس کے پاؤں من من کے ہو چکے تھے لیکن بری طرح سے تھک جانے کے باوجود وہ گھسٹ رہا تھا کیونکہ چلنے کے اس انداز کو گھسٹنے کے علاوہ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ تین چار گھنٹوں کی مسافت کے بعد وہ سڑک پر آ گیا لیکن اب اس میں چلنے کی سکت نہیں تھی۔ وہ سڑک کے کنارے ہی گر گیا اور پھر بیہوش ہو گیا۔ ہوش آیا تو قریب کچھ سِکے پڑے تھے اور کچھ پھل۔ کسی بھی جاندار میں زندہ رہنے کی جبلت انتہائی تیز ہوتی ہے۔ اس نے پہلے تو قریب پڑے ہوئے پھل اکٹھا کر کے کھائے اور پھر پیسے چن کر بے ارادہ ہی ایک طرف کو ہو لیا۔

کئی دن تک تو وہ یوں ہی چلتا رہا۔ اسے کچھ یاد نہیں آیا کہ وہ کون تھا اور اس پر کیا گزری تھی اور اب نہ ہی اسے ان باتوں کی پرواہ رہ گئی تھی۔ چلتے چلتے نہ جانے کہاں پہنچ کر وہ رک گیا اور پھر وہیں کا ہو کر رہ گیا۔ دریا کے کنارے کا یہ حصہ جہاں اس نے ڈیرہ جمایا تھا غیر آباد تھا۔ لیکن معاشرے کا رویہ بھی کبھی کبھی بالکل نہ سمجھ آنے والا ہوتا ہے۔ جب کوئی شخص اپنے بیوی بچوں کی ذمے داریاں نبھانے کے لیے جدوجہد کرتا ہے تو لوگ اس کی راہ میں روڑے اٹکانے یا اس کا مضحکہ اڑانے سے باز نہیں آتے لیکن جب وہ کسی وجہ سے ذمے داریوں سے کنارہ کش ہو کر معاشرے سے علیٰحدگی اختیار کر لیتا ہے تو لوگ اس قدم کو مستحسن قرار دے کر اس کے لئے آسائشیں فراہم کرنے لگتے ہیں۔ آہستہ آہستہ اس کی بات پھیلنے لگی اور لوگ اسے کوئی سادھو فقیر سمجھ کر آنے لگے اور ان کے ساتھ ہی کھانے پینے کا کچھ نہ کچھ سامان بھی آنے لگا۔ کچھ لوگ نقدی بھی دے جاتے تھے جس کی اب ضرورت نہیں تھی اور ویسے بھی اب اس کی ضروریات ہی کیا تھیں۔

دریا کے اس غیر آباد حصے میں نذیر کے رہ جانے کی وجہ بس یہ تھی کہ اب اس کے پاس کوئی ماضی ہی نہیں تھا اس لئے وہ جاتا بھی تو کہاں۔ شاید اسی لئے وہ کسی کے چہرے کی طرف بھی نہیں دیکھتا تھا کیونکہ اس کی یاداشت میں کوئی چہرہ محفوظ ہی نہیں تھا کہ وہ کسی کو پہچان سکتا۔ نہ وہ کسی سے بات کرتا اور نہ ہی اسے مخاطب کر کے کہی گئی کسی بات کا جواب دیتا۔ لوگ آتے، کچھ دیر وہاں بیٹھتے، کچھ نہ کچھ وہاں رکھ کر ماتھا ٹیکتے اور چلے جاتے۔ وہ سب کچھ خاموشی سے دیکھتا رہتا۔ جب اسے آہستہ آہستہ سب یاد آنے لگا تو اسے گھر واپس جانے کے سوا کچھ نہ سوجھی۔ اس نے نقدی جیب میں ڈالی اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ کسی راہگیر سے تاریخ پوچھنے پر اسے معلوم ہوا کہ اس حادثے کو ایک ڈیڑھ سال سے زیادہ کا عرصہ ہو چکا تھا۔ پتہ نہیں مسافروں کا کیا حال ہوا ہو، اس نے متاسفانہ انداز میں سوچا۔ تاریخ اور جگہ معلوم ہو جانے پر اس نے اندازہ لگایا کہ گھر پہنچتے پہنچتے چار پانچ گھنٹے لگ جائیں گے۔ سڑک کے کنارے ایک گندی سی چائے کی دکان پر اس نے چائے کے ساتھ کچھ سڑی بسی بیکری کھا کر اچھی طرح پیٹ بھر لیا اور پھر سڑک

کے کنارے گاڑی کا انتظار کرنے لگا۔ آدھے گھنٹے بعد اس کی مطلوبہ گاڑی آ گئی۔

نذیر اپنے گاؤں کے بس اسٹاپ پر اترا تو سورج قریب کی پہاڑی کے پیچھے اتر رہا تھا۔ سورج کی شعائیں سیدھے گاؤں میں تو نہیں آ رہی تھیں لیکن پہاڑی کے پیچھے آسمان روشن تھا اور لگتا تھا کہ زمین ہی پر روشنی کا کوئی منبع ہو جس سے روشنی کا عمودی اخراج آسمان کو منور کر رہا ہو۔ مگر کچھ دیر کے بعد اندھیرا ہونے لگا۔ نذیر کی داڑھی اور سر کے بال بے تہاشہ بڑھے ہوئے تھے اور اس کے پہچان لئے جانے کا خدشہ نہیں تھا لیکن پھر بھی وہ راستوں کے نسبتاً کم روشن حصوں میں چل رہا تھا۔ پنچایت گھر کے پاس پہنچ کر اچانک اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

پنچایت گھر کے داخلی دروازے کے قریب ایک چار پانچ فٹ اونچے چبوترے پر اس کا قد آدم مجسمہ ایستادہ کیا گیا تھا۔ حالانکہ اس قسم کے مجسمے عموماً سیاہ پتھر کے ہوتے ہیں مگر یہ مجسمہ سفید پتھر سے گھڑا گیا تھا۔ نذیر مجسمے کے چہرے سے اپنے چہرے کی مشابہت فوراً پہچان گیا۔ وہ غیر ارادی طور پر گلے میں پڑی میلی کچیلی چادر سے اپنا چہرہ مزید ڈھانپنے کی کوشش کرنے لگا۔

اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ کچھ دیر تک مجسمے کو دیکھتا رہا اور پھر اس نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا کہ کسی نے اسے پہچان تو نہیں لیا۔ وہ غیر شعوری طور پر اپنے آپ میں کچھ سکڑ گیا اور درختوں کے بڑھتے ہوئے سایوں میں تحلیل ہونے کی کوشش کرتے ہوئے آہستہ آہستہ اپنے گھر کی جانب کھسکنے لگا۔ اور پھر جب اس نے گھر پہنچ کر ڈیوڑھی کا دروازہ کھٹکھٹایا تو اسے اپنے دل کی دھڑکن صاف سنائی دے رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا اور اس کے بیٹے اسلم کا چہرہ نظر آیا۔

'کیا چاہیے بابا....'

اور نذیر نے گلے میں لپٹی ہوئی چادر کا پلو چہرے سے ہٹایا۔ لیکن اسلم اسے کچھ دیر تک گھورتا رہا اور پھر اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

'ابا.....تم.....؟' اسلم کچھ دیر تو حیرت سے اسے دیکھتا رہا پھر سنبھالا لے کر اس نے نذیر کا ہاتھ پکڑا اور ڈیوڑھی کے اندر کھینچا۔ جلدی سے کنڈی لگا کر وہ گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ پھر اس نے نذیر کی بانہہ پکڑی اور اسے تقریباً کھینچتا ہوا اندر لے گیا۔

'بیٹھو ابا.....میں ابھی آیا....'

تھوڑی دیر بعد اسلم واپس آیا تو اس کے ساتھ اس کی ماں سکینہ بھی تھی اور بہن شبنم بھی۔ سبھی نذیر کو صحیح سلامت دیکھ کر حیران ہو گئے۔ اسلم نے کہا:

'میں ابھی آیا....'

تھوڑی دیر بعد اسلم واپس آیا تو وہ سب کو اندر اناج کی کوٹھری میں لے گیا جہاں اس نے جلدی جلدی ایک چارپائی بچھا کر اس پر بستر لگا دیا تھا۔ نذیر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ شبنم کہیں سے لحاف لے آئی اور نذیر کو اوڑھا دیا۔ سکینہ جلدی سے رسوئی میں گئی اور کچھ دیر بعد ٹرے میں تین چار کپ چائے اور کھانے کے لئے کشمیری کلچے لے آئی۔ ایک تپائی پر ٹرے رکھ کر سبھی چائے پینے لگے۔

'جوتے کھولو اور.... پاؤں رضائی میں رکھ کر بیٹھو ابا....' اسلم نے کہا۔

' میرے پاؤں بہت میلے ہیں بیٹا....گندے....'

'کوئی بات نہیں ابا....' اسلم نے کہا اور خود ہی جھک کر اس کے پھٹے ہوئے جوتے اتار دیئے۔ نذیر نے ہچکچاتے ہوئے پاؤں لحاف کے اندر رکھے، بیٹی شبنم نے باپ کے سر کے نیچے تکیہ رکھا، اور نذیر کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

'کیا ہوا؟' سکینہ گھبرا گئی۔

' کچھ نہیں ....تم سب کو دیکھ کر....' نذیر کی بھرائی ہوئی آواز اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکی۔

نذیر نے رک رک کر تھکے ہوئے لہجے میں اپنے بارے

میں بتانا شروع کیا تو اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔اصل میں گزشتہ ایک سال کے دوران نذیر نے کن کن دشواریوں کا سامنا کیا ہوگا، اس کا تو احساس بھی اسے آج ہوا جب اس نے نہ صرف اپنوں کو دیکھا بلکہ ان کی چاہت اور محبت کو محسوس بھی کیا اور دیکھا بھی ۔نذیر کی آواز آہستہ آہستہ مدھم اور اس کا لہجہ خوابیدہ ہو گیا۔اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں ۔اسلم بہ آہستگی اپنے باپ کے چاروں طرف لحاف کو اچھی طرح سے لپیٹنے لگا۔سکینہ نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ اسلم نے دائرے کی شکل میں اپنے ہونٹ سکوڑ کران پر انگلی رکھی اور سر کو دروازے کی طرف ہلکا سا جھٹکا دے کر باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔سبھی لوگ بہ آہستگی کمرے سے نکل گئے۔

نذیر کا آدھا چہرہ لحاف کے ساتھ ڈھکا ہوا تھا۔گرم چائے کے سکون بخش گھونٹ ، سال بھر کی مسلسل تکان کے بعد، لحاف کی نرم آنچ، اپنوں کی قربت اور اپنے گھر کے یقینی تحفظ کا احساس، بے یقینی کے ایک طویل وقفے کے بعد تسلی اور تشفی کے یہ تمام عناصر خواب آور لوریوں سے کم نہیں تھے۔اس کے منہ سے اطمینان بخش خراٹوں کی ہلکی ہلکی آواز نکلنے لگی اور اب لحاف کی نرم اور خوشگوار آنچ کی لہریں اسے اپنی آغوش میں لے کر ٹھور کے ہچکولے دینے لگیں ۔مگر گزشتہ ایک سال سے اس کے اعصاب ان آسائشوں سے غیر مانوس ہو گئے تھے اور تھوڑے تھوڑے وقفوں سے اس کے حواس لمحاتی طور پر بیدار ہو کر کسی خود کار نظام کے تحت ماحول کا غیر شعوری ادراک کر سکنے کے اہل ہو گئے تھے ٹھیک اسی طرح جیسے جھاڑیوں میں رہنے والے پرندے اور جانور نیند میں بھی اپنی آنکھیں مختصر وقفوں کے لئے کھلی رکھ کر نادیدہ خطرات کے لئے تیار رہتے ہیں۔

ایسی ہی کچھ ہلکی ہلکی سی آوازیں تھیں کہ نذیر کی آنکھ کھل گئی۔اس کمرے کی طرح ساتھ والا کمرا بھی بلا دروازے کا تھا جس سے بات چیت کی آوازیں صاف آ رہی تھیں۔اسلم کہہ رہا تھا:

'تو حالت یہ ہے کہ ....اگر کسی نے ابو کو دیکھ لیا تو انشورنس کی رقم تو گئی....ساتھ میں حکومت نے جو پیسے امداد کے طور پر دیئے تھے وہ بھی واپس کرنے پڑیں گے ....سال چھ مہینے ابو نہ آتے تو کتنا بہتر ہوتا....سمجھا آپ نے؟'

وہ کچھ دیر تک لیٹے لیٹے سنتا رہا۔ بچے سیانے ہو گئے تھے۔سر پہ آ جائے تو انسان بہت کچھ سیکھ جاتا ہے، اچھا بھی اور برا بھی، نذیر نے سوچا اور کچھ دیر بعد آہستہ سے اٹھ کر باہر آیا۔اسے سب کے چہروں پر تشویش نظر آئی ۔اس نے ایک قدم مزید آگے بڑھایا تو سب اسے دیکھ کر چونک پڑے۔

'آپ آ گئے ابو....؟' اسلم کہنے لگا'....میں آپ کو جگانے ہی والا تھا.....ایک بہت بڑی مشکل آن پڑی ہے....آپ نے آتی بار پنچایت گھر کے پاس اپنا بُت دیکھا ہوگا.....حکومت نے اسے آپ کا بہت بڑا کارنامہ قرار دیا ہے کہ آپ نے اپنی جان پر کھیل کر بس کے مسافروں کی جان بچائی ..... حالآنکہ سب مسافروں کا بیان تھا کہ گاڑی کی رفتار خطرناک حد تک تیز تھی.....مگر انکوائری ہوئی اور اسے ٹیکنیکل خرابی کہا گیا.... بہر حال....حکومت نے کچھ معاوضہ بھی جلد ہی دے دیا تھا ....ابھی اور بھی ملے گا....اور اسی کے دم پر ہمارا وقت گزرتا رہا...لیکن انشورنس کمپنیوں کی کاروائیاں دیر تک چلتی ہیں.....اور اگر کسی نے آپ کو دیکھ لیا.... زندہ .....تو بس ہمارے پروگرام سب دھرے کے دھرے رہ جائیں گے..... پتہ ہے آپ کو ہمیں کتنا پیسہ ملنے والا ہے؟'

'حکومت کی طرف سے بہادری کے کئی ایوارڈ....اور انشورنس کے....کل ملا کر ....تقریباً دو کروڑ....ابو....دو کروڑ....امی ....دو کروڑ....'اس نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

'دو کروڑ.....'نذیر آہستہ سے بولا۔'دو کروڑ کے لئے تو میں سچ مچ مر سکتا ہوں....'

'اور میں سچ مچ مار سکتا ہوں....'اسلم کا لہجہ سفاک اور

چہرہ جذبات سے عاری تھا۔

کمرے میں ایک پُراسرار خاموشی اتنی دیر تک چھائی رہی کہ دلوں کی دھڑکنیں بھی سنائی دینے لگی تھیں۔

بالآخر نذیر کھنکار کر پھنسی پھنسی آواز میں بولا۔

'تو پھر؟'

'تو پھر یہ کہ آپ یہاں نہیں رہ سکتے....' اسلم نے فیصلہ کن لہجے میں کہا 'جب تک انشورنس کے پیسے نہیں مل جاتے آپ کو کہیں اور رہنا ہوگا ....صبح منہ اندھیرے نکل جایئے.....بعد میں دیکھ لیں گے..... پیسے مل جائیں تو ہم یہ گھر بار بیچ کر یہاں سے شہر ہی چلے جائیں گے.... یہ تھوڑے سے پیسے بھی رکھ لیں اپنے پاس ....'۔ اسلم نے باپ کے ہاتھ میں کچھ پیسے تھماتے ہوئے کہا۔'اور دیکھیے ....آنولے والی باؤلی سے دائیں طرف والے چڑھائی کے راستے سے جایئے گا جو سنسان ہی ہوتا ہے اور جو آپ کو پہاڑ کے دوسری طرف لے جائے گا.....'

نذیر پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا۔

رات بھر نذیر جاگتے سوتے میں اپنے بیٹے کے رویے کو تولتا رہا۔لیکن صبح اٹھا تو وہ اسلم کے فیصلے کو مناسب قرار دے چکا تھا۔اس نے سوئے ہوئے گھر والوں کو جگانا مناسب نہیں سمجھا۔ سکینہ رات ہی کو شبنم کے کمرے میں چلی گئی تھی۔اب کس سے ملنا ہے، اس نے سوچا اور ادھر ادھر دیکھا۔کوئی نہیں تھا۔پو پھٹ رہی تھی۔کہیں دور سے کسی کتے کی بھونکار سنائی دی۔گزشتہ دو سال میں نہ جانے کتوں کی کتنی نسلیں آ کر چلی گئی ہوں گی اور موجود نسل تو اس سے قطعی ناواقف ہے، اس نے لمحے بھر کو سوچا اور ادھر ادھر دیکھ کر احتیاطاً ایک لمبی اور قدرے موٹی ٹہنی اٹھا لی۔نذیر نے چاروں اطراف میں نظر دوڑائی۔یہ اس کا گھر تھا جسے آج کے بعد شاید وہ کبھی نہ دیکھ سکے اور گھر والوں کو بھی۔اس کی آنکھیں نم ہوگئیں اور حلق میں پھندا پڑ گیا۔نذیر نے سر جھکایا اور باہر کی جانب قدم بڑھائے۔دیکھا ڈیوڑھی کھلی ہوئی تھی اور اسے بچوں کی لاپرواہی پر تشویش ہونے لگی۔

نذیر تقریباً آدھے گھنٹے تک چلنے کے بعد آنولے کے درخت کے پاس پہنچا جہاں ایک باؤلی تھی جس کا ٹھنڈا پانی پی کر مسافر آگے کا سفر شروع کرتے تھے۔مگر نذیر نہیں رکا۔اس نے ایک نظر باؤلی کی طرف دیکھا اور بنار کے قدم آگے بڑھایا ہی تھا کہ ایک نسوانی آواز آئی:

'سنو.....'۔

نذیر چونک کر رکا اور اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔آنولے کے درخت کی اوٹ سے سکینہ سامنے آئی اور اس کے پاس آ کر رک گئی۔

'تم؟' نذیر نے حیرت سے اسے دیکھا'.... یہاں....؟'

'کیوں؟....بس تمہارے ساتھ....'

نذیر سکینہ کو دیر تک غور سے دیکھتا رہا، پھر جیسے بنا کہے ہی سب سمجھ گیا ہو۔اس نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے سر ہلایا اور ایک جانب بڑھتے ہوئے بولا'ٹھیک ہے....چلو....'

سکینہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر روکا اور بولی:

'نہیں....ادھر نہیں....ادھر.....'

'مگر ....مگر اسلم نے تو یہ راستہ کہا تھا.... پہاڑ کے دوسری طرف جانے کے لئے....'نذیر نے کہا۔

'اس راستے پر وہ کچھ لوگوں کے ساتھ تمہارا انتظار کر رہا ہے....'۔سکینہ کانپتی آواز میں کہنے لگی'....میں نے اسے فون پر کہتے سنا کہ وہ تمہارا رِسک نہیں لے سکتا.....تمہیں یاد نہیں اس نے کیا کہا تھا؟.....اتنے پیسوں کے لئے میں مار بھی سکتا ہوں....'

نذیر کسی سکتہ زدہ مجسمے کی طرح جم گیا۔

پہاڑی کے پیچھے سے اگتے ہوئے سورج کی نارنجی شعائیں سکینہ کی آنکھوں کے کونوں پر لرزاں قطروں کو منور کرنے لگیں۔

مشتاق احمد وانی

افسانہ

سماج

گورے گاوں کے کا کا رام کی بیوی پھولاں دیوی مویشیوں کی بڑی شوقین تھی۔ایک بھینس،کالے رنگ کی دودھ دینے والی گائے اوراس کی بچھیا،سفید رنگ کی دو بھیڑیں، ہرنی جیسی ایک بکری اور کالے رنگ کا ایک کتّا،اتنے سارے جانور پہلے ہی گھر میں موجود تھے۔نہ جانے اس کے دل میں یہ شوق کہاں سے آن ٹپکا کہ ان مویشیوں کے ساتھ ساتھ ایک گدھا بھی ہونا چاہیے۔اس سے رہا نہ گیا ایک روز وہ اپنے گھر والے سے کہنے لگی

''میں چاہتی ہوں ہمارے ان ڈھور ڈنگروں کے ساتھ ایک گدھا بھی کھیتوں میں چرا کرے۔اس لیے چھوٹا سا گدھا خرید کے لے آیئے ہمارے کام آئے گا''

کا کا رام اپنے مکان کی منڈیر پہ بیٹھا حُقّہ پی رہا تھا۔بیوی کی فرمائش سنی تو حقّے کی نے ہاتھ میں پکڑے حیرت سے بیوی کا چہرہ تکنے لگا۔پھر بولا

''گدھا خرید کے لے آوں! بھلا کس لیے؟ یہ آج تم کیا کہہ رہی ہو۔گدھا ہمارے کس کام کا؟ اتنے سارے جانور گھر میں رکھے ہیں،جن کو پالنا مشکل ہو رہا ہے اوراب کہہ رہی ہو گدھا بھی خرید کے لاو۔ابھی تمہارے من سے پالتو جانوروں کی لالسا نہیں گئی؟''

''میں اس لیے کہہ رہی ہوں کہ گدھا، جنگل سے بالن اور گھاس پھوس ڈھونے کے کام آئے گا۔میں بڑھاپے کی اور جا رہی ہوں ،میں نہ تو گھاس کا ترنگڑا اٹھا پاتی ہوں اور نہ لکڑیوں کا گٹھا اور پھر ہمارا بڑا بیٹا بالک رام اس سال شہر میں پڑھنے جا رہا ہے۔چھوٹا بیٹا بسنت راج اور بیٹی شلپا کتنا کام کریں گے''

کا کا رام اپنی بیوی کی باتیں سن کر خاموش رہا۔گدھا خریدنے کی فکر میں پڑ گیا۔اس نے بیوی کی فرمائش کو ہر ممکن ٹالنے کی کوشش کی لیکن ایک روز جب اس کی بیوی پڑوس کی عورتوں کے ہمراہ جنگل سے گھاس کا ترنگڑ لے کے آئی تو بڑے غصّے اور زور سے گھاس کا ترنگڑ پیٹھ پر سے دور پھینک دیا۔ایک لمبی آہ کے ساتھ بھری ہوئی سُستانے ایک طرف بیٹھ گئی پھر اس نے بڑے کرخت لہجے میں گھر والے کو کہا

''میں کب سے آپ کو کہہ رہی ہوں کہ چھوٹا سا گدھا خرید کے لاو تا کہ بوجھ ڈھونے کے کام آئے۔مگر آپ کے دل پہ کوئی اثر ہی نہیں ہوتا ہے۔میں ہی سولی پہ چڑھوں۔۔۔! آپ کو کوئی تکلیف نہ ہو''

کا کا رام، بیوی کے سامنے بھیگی بلّی بنے خاموش ایک طرف کھڑے اس کے احتجاجی رویّے کو غور سے دیکھتا رہا۔آخر کار اپنی بیوی کی فرمائش سے تنگ آ کر اس نے اپنے چھوٹے بیٹے بسنت راج کو اپنے ہمراہ لیا اور گھر سے کافی دور گدھا منڈی میں گدھا خریدنے چلے گئے۔چاروں طرف گدھے ہی گدھے تھے۔ان کی نظر ایک چھوٹے اور پھرتیلے گدھے پہ پڑی تو انھیں وہ پسند آ گیا۔گدھا فروش سے سودے بازی شروع ہوئی اس نے تیس ہزار روپے قیمت بتائی۔بڑی خوشامد اور منت سماجت کرنے کے بعد وہ پچیس ہزار روپے پہ راضی ہوا ۔سودا طے ہو گیا۔گدھا فروش نے پچیس ہزار روپے وصول کیے،گدھے کے گلے میں موٹی سی رسّی ڈالی اور گدھا کا کا رام کے حوالے کیا۔جونہی گدھا دوسرے گدھوں سے الگ ہونے لگا تو اس نے زور سے ڈھیچوں ڈھیچوں کی آواز میں اپنے ساتھیوں سے جدا ہونے کا دکھ ظاہر کیا۔بسنت راج نے گدھے کی اس حرکت کو دیکھ کے باپ سے پوچھا

''پتا جی!۔۔۔ یہ گدھا اچانک کیوں ہنہنا تا ہوا چیخ اٹھا۔اس کو کیا ہو گیا''

''بیٹا یہ نہیں چاہتا ہے کہ اپنے ساتھیوں سے جدا ہو''

دونوں باپ، بیٹا گدھے کو اپنے گھر لے جا رہے تھے۔ چلتے چلتے جب وہ دور ایک بستی میں سے گزرنے لگے تو لوگوں نے ان پہ آوازے کسنے شروع کیے۔کسی نے کہا

''دیکھو یہ باپ بیٹا کس قدر بے وقوف ہیں۔ان کے پاس سواری ہے، باری باری اس پہ سوار ہو کے آرام سے اپنے گھر پہنچ سکتے ہیں لیکن بے وقوفوں کے پاس عقل ہوتی تو ایسا نہ کرتے'' کسی نے کہا

''مورکھ ہیں جانے دو''

لوگوں کی یہ لعن طعن سنتے ہی بسنت راج نے باپ سے کہا

''پتا جی!۔۔آپ گدھے پہ سوار ہو جائیں۔ میں رسّی پکڑ کر اسکے آگے آگے چلوں گا۔لوگ ہم پہ ناراض ہو رہے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کوئی ہم پہ ہنسے یا ہمیں بے وقوف کہے۔لہذا آپ گدھے پہ سوار ہو جائیں''

کاکا رام نے بیٹے کی بات مان لی اور فوراً ایک ہی جست میں گدھے پہ سوار ہو گیا۔ چلتے چلتے ایک دوسری بستی میں پہنچے تو چند لوگ جوان اور ادھیڑ عمر کے ایک جگہ کھڑے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔انھوں نے جونہی کاکا رام کو گدھے پہ سوار اور بسنت راج کو ہاتھ میں رسّی تھامے گدھے کو لے جاتے دیکھا تو ایک دوسرے کو مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگے

''ارے۔۔۔!اس بے رحم باپ کو دیکھو! خود گدھے پہ سوار ہوا ہے اور بیٹے کو آگے آگے دوڑا رہا ہے۔لعنت بھیجو ایسے باپ پہ''

لوگوں کی باتیں سنتے ہی کاکا رام شرمسار ہو گیا۔لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہوتے ہی یکدم گدھے سے نیچے اتر گیا۔اب اس نے اپنے بیٹے بسنت راج کو کہا

''بیٹا! تم گدھے پہ سوار ہو جاو۔ میں رسّی پکڑتا ہوں''

''نہیں پتا جی! آپ کے ہوتے ہوئے میرا گدھے پہ سوار ہونا اور آپ کا پیدل چلنا مجھے اچھا نہیں لگے گا''

باپ کے اصرار پہ بیٹا گدھے پہ سوار ہو گیا۔ چلتے چلتے ایک اور بستی سے گزر ہوا تو کچھ لوگوں نے انھیں دیکھ لیا اور ان میں سے ایک نے بسنت راج سے پوچھا

''ارے تجھے شرم نہیں آتی خود گدھے پہ سوار ہے اور باپ کو پیدل چلا رہا ہے۔ کچھ شرم اور غیرت تو پیدا کرو''

لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہونے کے فوراً بعد بسنت راج گدھے سے نیچے اتر گیا۔غم و غصے سے اس کا چہرہ لال ہو گیا ۔راہ چلتے چلتے گدھا کافی تھک گیا تھا۔ وہ اچانک نیچے بیٹھ گیا۔اب وہ اپنے گھر کے قریب پہنچنے والے تھے۔ بڑی مشکل سے انھوں نے گدھے کو کھڑا کیا۔ لیکن وہ آگے چلنے کے لیے تیار نہیں ہو رہا تھا۔دونوں باپ، بیٹا پریشان ہو رہے تھے کہ آخر کیا کیا جائے! کاکا رام نے بیٹے کو صلاح دی

''بسنت۔۔۔ بیٹا! تم گدھے کی پچھلی دو ٹانگیں سنبھالو اور میں اس کی اگلی دو ٹانگیں سنبھالتا ہوں اور یوں گدھے کو گھر پہنچائیں گے''

بیٹا، باپ کی باتوں پہ خوش ہو گیا۔دونوں نے گدھے کو کندھوں پہ اٹھایا اور گھر کی طرف چل پڑے!

☆☆☆

رعائتی نرخ پر

ادیبوں و شاعروں کی کتابوں کے اشتہارات

''سب رس'' میں شائع کیے جاتے ہیں۔

افسانہ

میں تم سے

انسانی اقدار کی کیا قیمت ہوتی ہے؟ انسانی جذبات کیا ہوتے ہیں؟ کون آج کے دور میں کسی کے جذبات کو سمجھتا ہے؟ جب خون کے رشتے دھوکہ دے جائیں تو پھر کوئی کسی سے کیا امید کرے؟ وہ عالم تنہائی میں بیٹھی سوچ رہی تھی ، یادوں کا کبھی نہ ختم ہونے والا ایک لامتناہی سلسلہ جو تھمنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔اس نے کیا کیا سوچا تھا، اس کے دل میں کتنی امنگیں اور کتنی حسرتیں تھیں، اس نے بڑے کرب کے ساتھ سوچا، کاش کوئی اس کا بھی ہاتھ تھامنے والا ہوتا؟ تنہائی کی راتوں کا سہارا محبت کے امنڈتے ہوئے سیل بے قرار کا کنارہ ، دل کی پہنائیوں میں چھپے ہوئے رازوں کا امین۔کاش کاش عذرا، عذرا تو تھی ہی لیکن وہ اپنی دوشیزگی کی سرحد کو پار کر چکی تھی ، اور اب اس عمر میں تھی جب امنگیں دم توڑنے لگتی ہیں اور انسان اپنے بعد آنے والوں کی راہیں ہموار کرنے میں مصروف ہو جاتا ہے۔اس کی ساری کوششیں آنے والی نسلوں کی بہتری کے لیے صرف ہوتی ہیں اور خود اس کے سروں سے تمناؤں کا خمار اتر چکا ہوتا ہے۔روح آسودگی کی منزلوں سے گذر چکی ہوتی ہے اور نسوانیت کی جھکی ہوئی نگاہوں میں وصال کے وہ قدیمی لمحات پوشیدہ ہوتے ہیں جن کے تصور سے وہ خود سے بھی شرمانے لگتی ہے،لیکن اس تنہا روح نے ان آفاقی قدروں کو جانا ہی نہیں تھا،تن ڈھانکنے کے لیے چند گز کپڑے اور پیٹ کی بھوک مٹانے کے لیے چند خشک وتر نوالے اور بس،اس کے علاوہ کسی اور بھوک کا تصور کرتے وقت وہ کانپ جایا کرتی تھی کہ وہ چند ایک لوگوں کی زندگی کا سہارا تھی، اگر وہ جذبات کے طوفان میں بہہ جائے گی تو ان بے سہاروں کا کیا ہوگا جو آج بھی اس کی ڈھلتی ہوئی جوانی کے لیے کسی خوشگوار جھونکے کے منتظر ہیں۔کاش زندگی میں اس کا بھی کوئی سہارا ہوتا، کاش وہ یوں تباہ و برباد نہ ہوئی ہوتی، آخر زندگی نے اس سے کس جرم کا انتظام لیا تھا، یہ سوالات اکثر اس کے معصوم سے ذہن کو پریشان کرتے رہتے تھے،لیکن وہ انہیں سوالات سے الجھتے ہوئے جوان ہوئی تھی اور پھر جوانی کی لذتوں سے لطف اندوز ہوئے بغیر اس منزل سے بھی گزرے لگی۔زندگی میں کوئی بہتری کی امید ابھی تک نظر نہیں آئی تھی۔

اس کا بچپن بھی عام بچوں کے بچپن جیسا تھا، جب ایک معصوم بھائی اپنی پیاری سی بہنا کی تمناؤں کا امین اور اس کی مستقبل کی بہتری کے لیے کوشاں تھا، وہ جس کے حسن پہ ماہ تاباں بھی رشک کرتے تھے اور انجمنوں کی انجمن اس کی عظمت کو سلام کیا کرتی تھی۔اس کی ذہانت وفطانت اور خوش اخلاقی اور خوش کرداری کی تعریف میں ایک جہان کامل رطب اللسان تھا،لیکن افسوس کہ گردش کہن رفتار کو یہ خوش گواریاں راس نہیں آرہی تھیں،اس نے تاروں کی انجمن میں چاند کو بھیج کر تاروں کی روشنی کو مدھم نہیں کیا۔بلکہ تاریکی کا ایک بھیانک عفریت انجمنوں کی انجمن میں روانہ کر دیا، اور اس ہیبت ناک تاریکی نے کتنے معصوم تاروں کی ضیاء پاشیوں پر ہمیشہ کے لیے مہر تاریکی ثبت کر دی اور یہ تارے ایسے بجھے کہ ان کے لبوں سے مسکراہٹ تک غائب ہوگئی۔کوئی دیوانہ ہوا تو کسی کی زبان گنگ ہوگئی،کھیل ہی کیا کھیل کے سارے بول بھی بھلا دیئے گئے۔تاروں کی انجمن میں نغمہ شادی نہیں نوحہ فریادی کی گونج بیدار

ہوگئی اور دل حسرتوں کی آماجگاہ بن گئے۔اس کے بھائی کی گمشدگی نے اس کے دل کے تاروں کو کھنکنے کی اجازت سے محروم کر دیا، اور گیتوں کی لے کسی ویرانے میں صدائے گم گشتہ ہو کر رہ گئی۔

وہ اگر چہ حسن کا ایک کامل مرقع تھی لیکن اس کے باوجود اس کے اخلاق کی لچک اسے غرور و تکبر سے بے نیاز رکھتی تھی۔اس کی اسی فطری سادگی پر کتنے دلوں نے قربان ہونے کی اجازت چاہی تھی لیکن وہ اپنے جذبات سے خائف تھی اس نے محبت کے خراج کو قبولنے سے انکار کر دیا وہ میلے میں بھی تنہا تھی لیکن تنہائی میں بھی ایک انجمن تھی۔کبھی شادمانی، کبھی غم آلود نرماہٹ، کبھی دل میں چبھتی ہوئی سنجیدگی اس کی ذات کا طرۂ امتیاز تھی۔

زندگی کے ایام گن گن کر گزرتے جا رہے تھے، آخر اس کی زندگی میں ایک شخص آیا، جو ہر لحاظ سے کامل تھا، اس کی بولتی ہوئی آنکھیں ایک لمحہ میں ہزاروں افسانے سنانے والی تھیں، اس کی شوخیاں حسن کو شرمندگی پہ مجبور کر دیا کرتی تھیں، اس کی گفتگو ہر کسی کو مسحور کر دینے کے لیے کافی تھی، وہی مسکراتا ہوا کتابی چہرہ، وہی شوخ ادائیں، وہی نسیم وصبا جیسی چھیڑ خانیاں، وہی طنز کے ہلکے ہلکے نشانے، اور ہر ایک کسک کو مزاح کی لہروں کے شانے پر پرائے دلیش کے سفر پر روانہ کرنے والا انداز، اس نے بھی حسب سابق جانثاری کے لیے شمع درخشند و شرمندہ کن خورشید تابندہ سے اجازت چاہی، وہی پرانا خوف آج بھی حسن کے چہرے پہ پھیلا ہوا تھا، اس نے گھبرا کے اپنے قدم کو پیچھے ہٹایا، لرزتے ہوئے ہاتھوں سے اسے واپس جانے کا اشارہ کیا، مری دنیا کی کچھ وقعت نہیں ہے رقص و نغمہ کی مجھے عشق کے تصور سے خوف ہوتا ہے، مجھے مزید ہراساں نہ کرو، میرے سامنے نہ رہو، اف کتنی شدت تھی اس کے انکار میں، کتنی پختگی تھی اس کے لہجے میں اس نے اپنے لہجے کو بکھراؤ سے محفوظ رکھا تھا۔اس نے اپنا اٹل فیصلہ سنا دیا تھا۔

عاشق دل گیر بھی ساری رات جاگتا رہا کہ بارگاہ حسن سے اسے دھتکارا گیا تھا، تو حسن معصوم کو نیند سے کوئی واسطہ نہیں تھا، ایک خلش تھی جو دونوں کے دلوں میں موجود تھی، اک آگ تھی کہ دونوں طرف برابر لگی ہوئی تھی، مگر ایک طرف خود اپنے جذبات سے خوف تھا، تو دوسری طرف حسرت حرمان نصیبی، قلندروں کی زندگی میں تو صدائے دم دمادم کی تکرار ہوتی ہے، وہاں کوئی غم کہاں زیادہ دیر ٹھہرتا ہے، سو نہ ٹھہرنا تھا نہ ٹھہرا۔مگر حسن کو احساس پشیمانی تو دے آیا تھا، کس کے ساتھ مجبوریاں تھیں تو کسی کے پاس زمانے سے ٹکرانے کا حوصلہ، اور زمانہ کی گردشیں نہ تو خود سے ٹکرانے والوں کو معاف کرتی ہیں اور نہ ہی کسی کی مجبوریوں کا پاس رکھتی ہیں۔

وقت گزرتا جا رہا تھا، ہائم بھی اپنے روز و شب میں مصروف تھا، اس نے اپنی زندگی میں کسی کو بھی نہ شامل کرنے کی قسم کھا رکھی تھی، دو تنہا روحیں الگ الگ مقامات پر، الگ الگ انداز سے زندگی کے دن پورے کرنے لگیں، اس کی بھی زندگی ادھوری تھی تو ہائم بھی تشنہ تھا، تنہائی کا احساس یاروں کی محفل میں تو نہیں ہوتا کہ ہر غم کو مل جل کر ہنس کھیل کر بھلا دیا جاتا ہے لیکن جب تنہائی دامن گیر ہوتی ہے تو روح کی تنہائی بھی واضح ہو جاتی ہ اور ایک عجیب سی تشنگی کا احساس ہوتا ہے، تب محسوس ہوتا ہے کہ:

کسی کا اس کو، کسی کا ہے انتظار مجھے
نہ اعتبار اسے ہے، نہ اعتبار مجھے

ایک دن وہ بھی آیا، جب زندگی نے اپنی مصروفیتوں کا اصل جلوہ دکھایا، اور پھر دونوں ایک دوسرے کو دیکھنے تک کے لیے ترس گئے، ایک نے محبت ہاری تو دوسرے نے رسومات زمانہ کے سامنے سر تسلیم خم کیا تھا اور آخر کار علیحدگی کی منزلیں یوں طے ہوئی تھیں کہ اس

کے بعد کسی کو کسی کی خیریت بھی دریافت کرنے کی فرصت نصیب نہیں ہوئی تھی۔ نہ جانے وہ کس حال میں تھی اور وہ کیا کر رہا تھا، سب کی اپنی اپنی مصروفیتیں تھیں اور زندگی کے سحر و شام یونہی گزرتے جا رہے تھے۔ ہائم نے اپنی زندگی کے لیے ایک مقصد طے کیا تھا اور بظاہر ہر فکر و غم سے بے نیاز اور بباطن ہزاروں غموں کا بوجھ اٹھائے ہوئے چلا جا رہا تھا تو وہیں عذرا بھی سر جھکائے ہوئے اپنی راہ چلتی جا رہی تھی۔ کسی کی زندگی میں کتنے نشیب و فراز ہیں ان کا اندازہ دونوں میں سے کسی کو نہیں تھا ہر ایک کے سامنے اسی کی مصیبتیں زیادہ بڑی تھیں، اور اپنا بوجھ ہی زیادہ محسوس ہو رہا تھا۔

عذرا اسپتال میں ایڈمٹ تھی، ہائم اپنے آفس میں مصروف عمل تھا، جب اسے معلوم ہوا، مصروفیت اس قدر تھی سر اٹھانا دشوار تھا، ایک طرف دل نے کھینچا تو دوسری طرف روزانہ کا معمول دامن گیر تھا۔ کسی طور کام نپٹاتے ہوئے اور بقیہ کام اسسٹنٹ کے حوالے کرتے ہوئے اس نے اسپتال کی راہ لی۔ موبائیل سے رابطہ کرتے ہوئے اسپتال اور روم نمبر وغیرہ کی تفصیلات حاصل کرتے ہوئے وہ اسپتال جا پہنچا۔ عذرا بستر پر دراز گہری گہری سانسیں لے رہی تھی۔ پھولتی ہوئی سانسوں کے درمیان ہائم نے استفسار کیا: کیا ہوا؟ خیریت تو ہے؟ ڈاکٹر نے کیا کہا؟ بہتری کی امید رکھو۔

استفہام کے ساتھ دھڑکتا ہوا دل خیریت کی دعائیں بھی مانگ رہا تھا۔ موت و زیست کی کشمکش میں انسان خود ہوتا ہے تو اتنی تکلیف نہیں ہوتی ہے، جتنی تکلیف کسی ایسے شخص کو دیکھ کر ہوتی ہے جس سے کوئی جذباتی تعلق ہوتا ہے، حسن معصوم کا شکستہ مجسمہ سامنے تھا، جو حقیقت میں مجسمہ ہی تھا، ایک آہ نکلی:

کچھ تو منھ سے بول مجھ کو دیکھ دن بھر ہو گیا
او بت خاموش! کیا سچ مچ کا پتھر ہو گیا

عذرا نے آنکھیں کھول دیں، اس نے اپنی پیشانی پر ہائم کے ہاتھ کی گرمی محسوس کی۔ ہائم میرے ہائم میرے ہائم، میں چاہتی تھی کہ لیکن عذرا آنکھیں کھولو، یہ کیا بے وقت کی راگنی شروع کر دی تم نے، ہوش میں آؤ، تمہیں کیا ہوا یہ؟ میری طرف دیکھو، وہ اپنی خفت مٹانے کے لیے بولتا جا رہا تھا۔ بولتے بولتے اس کی آواز رندھ گئی اور گلا بیٹھ گیا۔ تمہیں کچھ نہیں ہوگا عذرا تم جلدی ہی شفایاب ہو جاؤ گی اور میرے ساتھ گھر چلو گی۔ تمہیں کچھ نہیں ہوگا عذرا تمہیں کچھ نہیں ہوگا، تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ نحیف و باریک سی ایک آواز اُبھری: ھائم غلطی میری تھی، میں نے زمانے سے دوستی نبھانے کے لیے کسی مخلص کے ہاتھ کو دھتکارا تھا، آج یہی دکھ میری جان کا روگ بنا ہوا ہے۔ میں نے زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی تھی اور آج اس غلطی کا احساس شدید تر ہے، دنیا کسی کی بھی نہیں ہوتی اور جو اخلاص کی قدر نہیں کرتا، تنہا رہ جاتا ہے۔ یہی کچھ میرے ساتھ ہوا، آہ مجھے یقین نہیں تھا کہ پھر کبھی ہمارا سامنا ہوگا، لیکن یہ میری خوش نصیبی ہے آج تم میرے سامنے ہو، مجھے اپنی تقدیر پر ناز ہے۔ لیکن عمر قیصر، مہلت دینے پر آمادہ نہیں، میں چند لمحوں کی مہمان ہوں، تھوڑی دیر کے لیے اپنے ہاتھوں کو میری پیشانی پر رکھ دو کہ

چلے بھی آؤ کہ میں اب سکوں سے مر تو سکوں
ترے بغیر مرا دم نہیں نکلتا ہے

ھائم!! میں تم سے محبت کرتی ہوں..... لیکن زمانے کی رسموں نے مجھے زباں بندی کا حکم دیا تھا اور وہ مجبور تھی۔ مجھے معاف کرنا..... یہ کہتے کہتے اس کی آواز ہچکیوں میں تبدیل ہوگئی..... اور ہائم سوچ رہا تھا کہ ''محبت کسے کہتے ہیں؟'' محبت سماج کی پابند ہوتی ہے یا مذہب کی یا دونوں سے آزاد کوئی اور جذبہ؟

انجم پروین

مطالعہ

ناول ''تخم خوں''۔دلت طبقے کی زندگی پر ایک مکالمہ!

صغیر رحمانی نے اردو فکشن کے ہم عصر رجحان کے تحت پسماندہ اقوام ،بے بس اور کمزور جماعت کے مسائل ،دلت اور اقلیتی طبقے کی نمائندگی اپنے مخصوص انداز میں کی ہے ۔یہ مسائل دیگر فنکاروں کے یہاں بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔شموئل احمد کا 'القمبوس کی گردن'،سید محمد اشرف کا 'آدمی'عبدالصمد کا 'انہونی'غضنفر کا 'خالد کا ختنہ'حسین الحق کا 'نیو کی اینٹ'احمد صغیر کا 'مریادا'مشرف عالم ذوقی کا 'بخاری کی نیپکن'اور صغیر رحمانی کا 'لیکن یہ'چھو۔تی۔تی۔تی۔تا'اور 'ناف کے نیچے' قابل ذکر افسانے ہیں۔جو ناقدین افسانے کے موضوعات کے حوالے سے اس واہمہ کی زد میں ہیں کہ ''اردو افسانہ بین الاقوامی مسائل سے بے نیاز ہے،اسے میڈیا کے رول کی خبر نہیں،انھیں علاقائی مسائل سے دلچسپی نہیں۔دلت اور پس ماندہ معاشرے پر نظر نہیں جاتی۔'' وغیرہ غالباً مذکورہ افسانوں پر ان کی نظر نہیں پڑی ۔صغیر رحمانی کا معروف افسانہ ''واپسی سے پہلے''،''ایک اور وہ''اور ''مونا''بین الاقوامی مسائل،غیر ملکی فضا اور طرز معاشرت کو درشاتے ہیں۔

ناف کے نیچے افسانہ میں سماج کے دبے کچلے اور دلت طبقے کی زبوں حالی کو موضوع بنایا گیا ہے۔پس ماندہ طبقہ کس طرح اپنی گزر بسر کے لیے جدوجہد کرتا ہے،روزی روٹی کے لیے بڑے گھروں میں خدمت انجام دیتا ہے۔لیکن یہی طبقۂ اشرافیہ،مذہبی ٹھیکیدار اور سیاسی رہنما کس کس انداز میں انکا استحصال کرتے ہیں۔صغیر رحمانی کے یہاں اس کا بڑا بے باک بیان ملتا ہے۔اس افسانے میں کہیں احتجاج ہے تو کہیں ان ناگفتہ بہ حالات سے سمجھوتہ۔جب یہ دبے کچلے افراد ظلم و ناانصافی کے خلاف احتجاج کرتے ہیں یا اپنے حقوق کے تئیں بیدار ہوتے ہیں وہیں ان کا گلا گھونٹ دیا جاتا ہے۔سماج کے مختلف طبقے الگ الگ سطحوں پر ان کا استحصال کرتے ہیں۔یہ لوگ کبھی سیاست کی بساط پر مہروں کا کام انجام دیتے ہیں،تو کبھی فسادات کی آندھیاں چلا کر ان کی بیخ کنی کی جاتی ہے۔اس افسانے میں انسان کی انتہائی بے بسی و لاچاری اپنی تمام تر 'کراہ' کے ساتھ موجزن ہے۔ڈاکٹر سید احمد قادری کے مطابق:

> صغیر رحمانی کے افسانوں کے عنوان بھی بڑے معنی خیز ہوتے ہیں جو قاری کو چونکانے کے ساتھ ساتھ فوری طور اس طرح متوجہ کر لیتے ہیں کہ قاری افسانہ پڑھنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور ان کے افسانوں کے بیانیہ طرز اظہار کی خوبی اس طرح اپنے ابتدائی جملوں سے ہی قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے کہ دھیرے دھیرے قاری افسانے کی سحر میں کھوتا چلا جاتا ہے اور جب افسانہ ختم ہوتا ہے۔ تب وہ جہاں ایک جانب افسانہ کی سحر سے نکلتا تو ضرور ہے لیکن دوسری طرف فکر و احساس کی دنیا میں ڈوبتا چلا جاتا ہے۔''

افسانوں کے علاوہ صغیر رحمانی نے دلت طبقہ سے متعلق مسائل،اس کی نفسیات اور اس کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کو اپنے ناول 'تخم خوں'(۲۰۱۶) میں زیادہ وسیع کینوس پر پیش کیا ہے۔یہ ناول اپنے موضوع ،دلت ڈسکورس سے نئے ذائقے اور نئی

عصری حسیت کے ساتھ انصاف کرتا ہے۔تخم خوں کو اس اعتبار سے اردو کا پہلا ناول ہونے کا شرف حاصل ہوا ہے کہ یہ ہندوستان کے دیہی سماج میں ہونے والی تبدیلیوں، دلت ڈسکورس ،سامنت واد، برہمن واد اور نکسل موومنٹ کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔اس ناول کے حوالے سے بر سبیل تذکرہ اتنا عرض کرتی چلوں کہ دبے کچلے افراد اور دلت موضوع کو وہی فنکار پوری شدو مد کے ساتھ تخلیقیت کے جامے میں پیش کرسکتا ہے جس نے اس طبقہ کے مسائل، طرز رہائش، کھان پان کا قریب سے مشاہدہ کیا ہو، ان کے درد کو اپنے خون جگر میں انڈیلا ہو، تو بلا خوف یہ کہا جاسکتا ہے کہ صغیر رحمانی نے ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں کی مسافتیں محض اس لیے ناپیں تاکہ دیہی کلچر، دلتوں کے مسائل ومشکلات، بہار کی معاشرتی صورتحال کی تصویر زیادہ مؤثر طریقے سے کھینچ سکیں۔اپنے ناول تخم خوں کے ضمن میں مصنف صغیر رحمانی خود رقم طراز ہیں:

''میرا موقف اس پر ہے۔۔۔کہ ادب معاشرے کا آئینہ ہوتا ہے، تو اس آئینے میں تو سب کچھ دکھنا چاہئے۔تخم خوں ؛وہی آئینہ ہے۔ جب آپ اس کے روبرو کھڑے ہوں گے تو آپ کو اس میں بہار کے دیہی سماج کا وہ چہرہ نظر آئے گا جو آپ نے ہم عصر اردو ادب میں شاید ہی (یہ میرا دعویٰ نہیں، یقین ہے) دیکھا ہو۔''

اس ناول میں کئی اہم کرداروں سے سابقہ پڑتا ہے لیکن ناول کے مرکزی کردار ٹینگر اور اس کی بیوی بلایتی ہیں۔جو دلتوں کے چمارٹولے سے تعلق رکھتے ہیں اور زمینداروں کے کھیتوں پر مزدوری کرتے ہیں۔ٹینگر نامرد ہے دونوں میاں بیوی اولاد کے سکھ سے محروم ہیں بالخصوص بلایتی بچے کے لیے زیادہ چھٹپٹاتی ہے۔ اولاد سے محرومی ایک عورت کے لیے انتہائی تکلیف دہ بات ہے۔ خاص کر ایسی عورت کے لیے جو پورے گاؤں کی زچگی کراتی ہے اور ایسے موقعوں پر بلایتی گاؤں والوں کے لیے ایک ناگزیر ضرورت بن جاتی ہے۔ٹینگر کو اپنی نامردی کا ہمیشہ قلق رہتا ہے لیکن کبھی اپنے دکھ کا کھل کر اظہار نہیں کر پاتا جبکہ بلایتی بچے کے حوالے سے امید کی جوت جلائے رکھتی ہے۔یہی امید اور ناامیدی کی کیفیت ناول کی پوری فضا پر چھائی رہتی ہے۔ناول کا بیشتر حصہ بچے کے لیے بلایتی کی جدو جہد کو محیط ہے۔اپنی اس ازلی خواہش کی تکمیل کے لیے وہ ہر حد لانگھنے کو تیار ہے۔لہذا بلایتی ایک جانے مانے گیانی اوجھا جی کے پاس جاتی ہے تاکہ وہ کوئی حل بتا سکیں، اوجھا جی اس سے کہتے ہیں ''مرد کو ساتھ لے کر آ....تیری سمسیا کا سمادھان ہو جائے گا۔'' تو وہ اپنے پتی ٹینگر رام کو ان کے پاس لے جاتی ہے۔وہ ان دونوں کو دیکھ کر جو کچھ کہتا ہے اور جو سمادھان بتاتا ہے وہ بلایتی کی زندگی کا المیہ بن جاتا ہے۔وہ کہتا ہے:

''کھیت ہی خراب ہے، بیج انکھوا نہیں پا رہا ہے، کھیت کسی برہمن سے شدھ کرانا ہوگا۔''

اس کی باتیں سن کر بلایتی متحیر رہ جاتی ہے لیکن اپنی ممتا کی تسکین کے لیے وہ ہر اقدام اٹھانے کو تیار ہو جاتی ہے اور کسی ایسے برہمن کو تلاشنے لگتی ہے جو اس کے کھیت کو شدھ کردے۔اس کام کے لیے اسے پنڈت کا ناتیواری زیادہ موزوں لگتے ہیں دو چار بار چکر لگانے کے بعد ایک دن وہ اپنی عرضداشت ان کے سامنے بیان کردیتی ہے:

''پنڈت جی میرا کھیت شدھ کر دیجئے.....اوجھا جی نے کہا تھا کسی با بھن سے.....

اس کی بات سن کر پنڈت جی تلملاتے ہوئے جواب دیتے ہیں:

''ارے تو کیا چاہتی ہے، میں تیرا کھیت شدھ

کروں؟ میں تیرے ساتھ سمبھوگ
کروں؟ میں؟ ایک براہمن؟ ارے نیچ ذات کیوں
میرا ستیاناش کرنے پر تلی ہے؟ کیوں میرے کل
ونش کا ناش کرنے پر تلی ہے؟ میں یہ نہیں کرسکتا، نہیں
کرسکتا۔''

ایک برہمن کی منت سماجت کرنا بلایتی کو ذرا بھی معیوب نہیں لگتا کہ وہ ایک غیر مرد کو ناجائز تعلق استوار کرنے پر بضد ہے کیونکہ یہاں اس کا مقصد محض اپنی گودہری کرنا ہے لیکن یہ بات لوگو ں کے اندھ وشواس اور ضعیف الاعتقادی کا مظہر ہے۔ اسے تو وہی کرنا ہے جس کی اوجھا نے قید لگائی ہے۔ اس سے ایک دوسرے پہلو پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ اوجھا جیسے ڈھونگیئے عوام کو گمراہ کر کے ان پر اپنی برتری کا رعب جھاڑتے ہیں اور خود کو عوام کی خوشیوں ،امیدوں اور محرومیوں کا ضامن سمجھنے لگتے ہیں۔ کھیت کی شدھی کے لیے برہمن کی قید لگانے سے جو رعب و دبدبہ بلایتی اور اس جیسے اندھی تقلید کرنے والوں پر پڑا وہ اس بات سے کہ کسی بھی ذات کے مرد سے شدھی ہونی چاہئے، ہرگز نہیں پڑتا۔ آج ہمارا ملک صرف جسمانی غلامی کی بیڑیوں سے تو آزاد ہے لیکن ذہنی اور نفسیاتی طور پر یہاں کے لوگ آج بھی غلام ہیں، اندھ وشواسی ہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ تعلیمی بیداری سے بے بہرہ ہیں۔

'تخم خوں' ایک ایسا آئینہ ہے جس میں غریبوں، مزدوروں ،جاہل دیہاتیوں اور عوام الناس کی تصویریں اس قدر صاف اور خوف ناک ہیں کہ اس پر ہلکی سے ہلکی نظر ڈالنے والا بھی دہل جائے۔ المناک وارداتوں اور ناقابل بیان کلفتوں سے لبالب بھری زندگی تقریباً ۳۵۱ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ ناول کے ضمن میں پروفیسر ارتضیٰ کریم سہ ماہی رسالہ فکر و تحقیق 'ناول نمبر' کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''ناول چونکہ زندگی کے تمام سماجی، سیاسی، ثقافتی اور تمدنی مظاہر کا آئینہ ہوتا ہے، اسی لیے ناول نگار کا مخاطب صرف ایک فرد یا مخصوص معاشرہ نہیں ہوتا بلکہ پورا معاشرہ اس کے پیش نظر رہتا ہے۔ وہ اپنے مشاہدات اور تجربات کو اپنے بیانیے کا حصہ بناتا ہے اور عمومی انسانی نقطۂ نظر سے الگ کچھ نئے زاویے سے کائنات کو دیکھتا ہے۔ جس ناول نگار کا مشاہدہ اور تجربہ زیادہ گہرا ہوتا ہے اس کا ناول اتنا ہی پراثر اور مضبوط ہوتا ہے۔''

(فکر و تحقیق، ناول نمبر۔ اپریل۔ جون، ص:۵)

تخم خوں ایسا ہی ناول ہے جس میں سماجی سطح پر منقسم طبقاتی تفریق کے باعث انسانیت کی تذلیل اور ارزانی کو دکھایا ہے۔ اس کے کردار ایک پل جینے کے لیے ہر پل مرتے ہیں تاہم زندگی سے ہار نہیں مانتے۔ ناول کے بعض تراشے تو ایسے ہیں جو قاری کو کہیں سسکنے پر مجبور کر دیتے ہیں تو کہیں زیر لب مسکرانے پر۔ اس مسکراہٹ کا سبب ہے پنڈت کا ناتیواری کا توتلا اور معذور بیٹا ''من جی بابا'' جس کی زبان سے مکمل توتلے الفاظ کا ادا ہونا جو ناول نگار کی تخلیقی صلاحیت اور زبان و بیان پر مکمل عبور کی واضح دلیل ہیں:

''آدہی آیا ہوں لیتن تو تون ہے؟ تا ہے
آئی ہے؟'' من جی بابا نے سوالوں کی
بوچھاڑ کر دی۔
''بابا۔۔۔ میں بلایت۔۔۔۔'' وہ رک
رک کر بول پائی۔
''الے بلائتی تو ہے؟ اتنی بلی ہودئی؟ اتھا
بول تیا تام ہے۔'' [ص ۵۵]

صغیر رحمانی نے کردار نگاری، منظر نگاری اور جزئیات نگاری کے توسط سے ناول کی بنت میں جس نہج کی مہارت اور مشاقی کا مظاہرہ کیا ہے ان کی نفسیات میں گہرے اتر کر اور مکالموں کی مدد سے کرداروں کی سوچ اور فکر تک جس انداز سے رسائی

حاصل کی ہے یہ ان کے گہرے مشاہدہ اور تجربے کو ظاہر کرتا ہے ۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے کردار تخلیق کرنے سے پہلے ان سے ملتے جلتے کرداروں کی زندگیوں، ان کے مسائل کا بھرپور جائزہ لیا ہے تب جا کر ان کے ناول کے کردار وجود میں آئے ہیں۔ عبدالصمد صغیر رحمانی کو لکھے گئے ایک خط میں ناول 'تخم خوں' پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے خیالات کا کچھ یوں اظہار کرتے ہیں:

''مجھے اس بات پر حیرت ہے کہ آپ نے جس معاشرہ کی تصویر کشی کی ہے اس کی اتنی صحیح عکاسی آپ کیسے کر سکے ہیں؟ ان لوگوں کے رہن سہن، بولی چالی، کھانے پینے، مزاج، ویوہار کی ایسی واقفیت آپ کیسے حاصل کر سکے ہیں؟.....آپ نے ناول میں اپنے کرداروں کی زبان ہی استعمال کی ہے جو ظاہر ہے بہت عام فہم نہیں ہے، پھر بھی پڑھنے والے کی دلچسپی اس میں برقرار رہتی ہے۔اس کی وجہ.... کہ یہ ایک ایسا موضوع ہے جو زندہ و آئندہ ہے، ہمارے آس پاس کا ہے، ہم کسی نہ کسی صورت میں تقریباً روز ہی اس سے نبرد آزما ہوتے ہیں۔اردو میں اس موضوع پر بہت پہلے لکھنا چاہئے تھا۔میں نے بھی 'دھمک' میں اس موضوع کو ہاتھ لگایا تھا، مگر آپ نے جس عرق ریزی اور گہرائی سے اس کا مطالعہ کیا ہے، وہ صرف آپ کا ہی حصہ بن گیا ہے۔نہ صرف موضوع بلکہ کہانی کا اتار چڑھاؤ اور کردار نگاری یاد رکھنے کی چیزیں ہیں۔ مجھے خاص طور پر یہ بات بہت اچھی لگی کہ سب کچھ تباہ ہو جانے کے بعد بھی آپ نے مستقبل کی ایک روشن لکیر کو بچایا۔میرا ہمیشہ سے یہ ایمان رہا ہے کہ ناول نگار یا افسانہ نگار کو گھٹا گھور تاریکی میں بھی ایک روشن لکیر کو بچا لینا چاہئے۔یہ ایک ناول نگار کا منصب ہے۔اس کی تحریر ایک خفیہ پیغام ضرور ہونا چاہئے ورنہ پھر لکھنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ آپ نے ایک ناول نگار کی حیثیت سے اپنے منصب کو خوب پہچانا ہے۔''

اس ناول میں صوبۂ بہار کے معاشرتی نظام میں رائج توہم پرستی، روایت پرستی اور غلط مذہبی رسوم کو منظر عام پر لایا گیا ہے۔ سماج کئی ذاتوں میں بٹا ہوا ہے، برہمن، کھشتریہ وغیرہ، اونچی ذات والے خود کو ناف کا اوپری حصہ یعنی سب سے افضل و برتر تصور کرتے ہیں جبکہ اپنے سے نیچی ذات کو ناف کے نچلے حصہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ذات کی یہی تفریق ناول کی تھیم کو دو طبقاتی حصوں میں منقسم کرتی ہے ایک حصہ میں اعلیٰ وادنی کے مابین پنپنے والے تضادات پر روشنی پڑتی ہے اور دوسرے حصہ میں بلایتی کی جدو جہد اور کشاکش سامنے آتی ہے۔ایک فرقے کی نمائندگی پنڈت کانا تیواری، پاٹھک جی کرتے ہیں دوسرے کی بلایتی۔ یہ لوگ ان پر اپنا دبدبہ قائم رکھنے کے لیے سبھی حربے استعمال کرتے ہیں۔ نچلی ذات والوں پر ظلم و جبر کرنا، استحصال کرنا اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہیں۔اسی لیے پنڈت کانا تیواری کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہتا جس سے اس کی بدنامی اور رتبے میں کمی واقع ہو۔

پنڈت ہونے کے ناتے برہمنوں کا رعب و دبدبہ باقی دلتوں اور شیڈیول کاسٹ کے لوگوں پر جمانے کے لیے سبھائیں

کرتا ہے، لیکن دوسری جانب چوری چھپے حیوانوں کی ہڈیوں کا گھٹیا پیشہ کرتا ہے۔ اور اس کا روبار کا بے نامی لائسنس ٹینگر کے نام پر ایک شیڈیول کاسٹ افسر ہی سے ایشو کراتا ہے اور اپنے ذاتی مفاد کے لیے ٹینگر کی بیوی بلایتی کو استعمال کرتا ہے۔ اپنی غرض کے لیے یہ لوگ ہر طریقے کو جائز سمجھتے ہیں۔

ان کے اس استحصال کا صرف ایک ہی طبقہ ذمہ دار نہیں ہے دیکھا جائے تو یہ لوگ خود بھی اپنے ساتھ زیادتی کرتے ہیں، اس طرح کہ اپنے ساتھ ہونے والے ظلم و جبر کے خلاف احتجاج نہیں کرتے اور اپنی عزت و بے عزتی کی کوئی پروا نہیں، دوسرے کہ وہ خود ان کے ساتھ ایسے ناجائز کاموں میں ملوث ہو جاتے ہیں جس میں اپنا مفاد شامل ہو۔ تبھی تو انجانے میں ٹینگر اپنی بیوی کو خود شاطر پنڈت کانا تیواری کے ساتھ بی ڈی او کی جنسی تکمیل کے لیے اس کے پاس چھوڑ کر آتا ہے۔ وہ بیوی کے ساتھ ساتھ پنڈت کے ہاتھوں اپنا بھی استحصال کراتا ہے اس بات کا انکشاف اسے اس وقت ہوتا ہے جب گاؤں کے ہسپتال میں جانوروں کے معالجہ کے لیے جو ٹیکے اور دوائیاں آتی ہیں اور کانا تیواری اپنے منافع کی غرض سے ان میں ہیر پھیر کر کے ٹینگر کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے بند کرا دیتا ہے۔ تب ٹینگر ساری صورتحال پر غور کر کے پنڈت کانا تیواری سے دریافت کرتا ہے ''ہجور! آپ کے جانور کیوں نہیں مرے تھے؟'' اس سازش کے ظاہر ہوتے ہی سارے گاؤں میں برہمنوں اور پنڈتوں کے خلاف محاذ آرائی شروع ہو جاتی ہے۔ چمار اور دلت اپنی غربت اور ناخواندگی کے باعث سب کچھ اپنی تقدیر کا لکھا سمجھ کر آگے بڑھنے سے گریز کرتے ہیں۔ انھیں منظم کرنے کیلیے کمیونسٹ خاص کر نکسل وادی کمیونسٹ دن رات لگے رہتے ہیں۔ جو بعد میں ایک سیاسی ایشو بن جاتا ہے، جس کا ناول میں تفصیلی ذکر ہے۔

گاؤں کے حالات ناسازگار ہونے کے باوجود بلایتی پنڈت کا نا تیواری کے گھر کام کرنا نہیں چھوڑتی۔ کیونکہ اس گھر سے اس کا کافی پرانا رشتہ ہے اور وہ رشتہ من جی بابا سے ہے۔ من جی بابا پنڈت کانا تیواری کی اکلوتی اولاد تھی۔ پیدائشی معذور۔ چھ، سات سال قبل جب پنڈتائین کا انتقال ہوا تھا، وہ صرف نو سال کے تھے۔ اس وقت بلایتی ہی تھی جس نے ان کا ہر اچھا برا کام کیا تھا۔ پھر وہ اپنی موسی کے یہاں شہر چلے گئے، بس چند دنوں کے لیے ہی بیچ بیچ میں گاؤں کا چکر لگا لیتے تھے۔ اکثر جب بلایتی رات کی تاریکی میں پنڈت سے ملنے آتی تو من جی بابا سے اُس کی مڈبھیڑ ہو جاتی۔ بلایتی پنڈت کے گھر کے چکر صرف اپنی مراد پانے کے لیے ہی لگاتی تھی لیکن پنڈت اس کو ایک چال سمجھتا تھا۔ جب بھی وہ کھیت شدھی کی بات کرتی پنڈت ہمیشہ اس کی تذلیل کرتا:

> ''ارے نیچ ذات! اب میں تجھ سے کیا کہوں؟ تم لوگ تو سر پر چڑھ کر موتنے لگے ہو۔ اصل میں قصور تم لوگوں کا نہیں ہے۔ یہ سب 'لال جھنڈین' کروا رہا ہے۔ ان ہی سبوں نے تم لوگوں کو ہاتھی کے کان پر چڑھا رکھا ہے۔ کسی کو کچھ سمجھ ہی نہیں رہے ہو تم لوگ۔ جو منہ میں آ رہا ہے، بول بک دے رہے ہو لیکن میں بھی کہہ رہا ہوں۔ یہ ٹھیک نہیں ہے، یہ ٹھیک نہیں ہے۔ تو جس سازش کے تحت یہاں آ رہی ہے، اس میں میں تجھے کبھی کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔ اب تو جا یہاں سے۔''

اس ناول کا مرکزی حصہ یہی ہے کہ پنڈت اس وجہ سے بلایتی کو دھتکار دیتا ہے کہ ایک شودر کے ساتھ شہوانی عمل کرنے سے وہ حاملہ ہو سکتی ہے۔ ایسی حالت میں وہ ایک براہمن کنیا یا پتر کو جنم

دیگی۔ پھر اسکی شادی اپنی ہی ذات یعنی کہ کسی شودر سے کریگی۔اس حالت میں اگر کنیا ہوئی تو ایک براہمن کنیا کا بھوگ ایک شودر کرے گا۔ یہ براہمن واد کی انتہا ہے کہ وہ بلایتی کی التجا کو بھی رد کر دیتا ہے کہ وہ ایک چمائین ہے لیکن دوسری طرف یہ پنڈت اور برہمن دوغلی زندگی جیتے ہیں۔منہ میں رام رام اور دلوں میں تعصب، بھرشٹا چار اور لالچ جس کی عمدہ مثال ناول کا اثر انگیز کردار، پنڈت کانا تیواری ہے۔جو کسی نچلی ذات سے مس ہو جانے کو اپنا دھرم بھرشٹ ہونا سمجھتے ہیں۔کہانی میں ٹوسٹ تب آتا ہے جب اتفاقاً ایک واقعے میں پنڈت کانا تیواری کا بیٹا من جی بابا بلایتی کے ساتھ زیادتی کر بیٹھتا ہے اور بلایتی حاملہ ہو جاتی ہے۔جس کام کے لیے پنڈت آخری وقت تک منکر رہتا ہے وہ اس کا بیٹا من جی بابا بلایتی کے ساتھ زور زبردستی کر کے انجام دے دیتا ہے۔اس طرح بلایتی کے کھیت کی شدھی بھی ہو جاتی ہے اور برسوں پرانی اس کی خواہش کی تکمیل بھی۔پنڈت اسکا حمل گروانے کے لئے کون جتن نہیں کرتا کہ اس کے حمل میں پنڈت کی اپنی ہار صاف نظر آرہی تھی۔پنچایت انتخابات میں بلایتی کے مقابلے کسی طور جیت حاصل کر لینے پر پنڈت بڑے غرور سے کہتا ہے کہ ''مجھ سے ٹکرانے چلی تھی، پہاڑ سے ٹکرانے چلی تھی، ہم صرف جیتنے کے لئے ہیں، ہم صرف جیتتے ہیں۔۔۔'' تب بلایتی کا یہ کہنا۔۔۔''نہیں مالک، آپکی ہار تو میری کوکھ میں پل رہی ہے۔۔۔'' ایک کھلا چیلینج ہے براہمن وادی اور منووادی نظام پر اور بلایتی کا یہ چیلینج اس نظام کو پوری طرح سے ہلا کر رکھ دیتا ہے۔

پہلی نظر میں یہاں کچھ سوال ذہن میں کوندنے لگتے ہیں کہ اب جبکہ بلایتی کی دیرینہ آرزو کی تکمیل ہونے جا رہی ہے پنڈت کے معذور بیٹے کے توسط سے ہی صحیح، لیکن وہ اس معاملے کی تشہیر کر کے اس کو زنا بالجبر قرار دے کر تنازعہ کیوں کھڑا کرتی ہے ؟اسے تو اس بات کو پردۂ راز میں رکھنا چاہئے تھا۔ بلایتی کے بلاتکار کے بارے میں تنظیم کو کس نے مطلع کیا؟اس راز سے تو صرف بلایتی اور من جی بابا کے سوا کوئی واقف نہیں تھا؟ تو اسکا جواب یہ ہے کہ وہ اپنا کھیت شدھ کرانے پنڈت کے پاس جاتی تھی کہ یہ اسکی اپنی مرضی تھی لیکن من جی بابا نے جو کیا اس میں مرضی کا نہیں زبردستی کا دخل تھا اور ہمیں اثبات ونفی کے اس باریک فرق کو سمجھنا ہوگا۔اسی طرح قاری ٹینگر کے کردار کو لیکر بھی کسی حد تک بھول بھلیا کا شکار ہو سکتا ہے کہ اتنا سب کچھ ہو جانے کے باوجود کہ اس کی اپنی بیوی انتہائی اذیت میں ہے، خود اپنا ہی چمار طبقہ چاروں طرف سے آفتوں اور مصیبتوں میں گھرا ہوا ہے۔ٹینگر تب بھی پنڈت کی غلامی کرتا رہتا ہے اس کی زیادتیوں اور ناقابل تلافی کرتوتوں کو جان بوجھ کر پوشیدہ رکھتا ہے۔مزید برآں کہ نکسل واد تنظیموں سے بھی وابستہ رہتا ہے۔ حالانکہ یہ دونوں ہی مرکزی کردار ہیں اور دلت طبقہ کے نمائندہ بھی۔اگر یہ لوگ اپنے اوپر ہونے والے مظالم اور جبر کے خلاف مظاہرہ کرتے، سب کچھ اپنی تقدیر کا لکھا سمجھ کر اس پر اکتفا کر کے نہیں بیٹھ جاتے تو یوں ساری زندگی ذہنی عذاب اور جسمانی کلفتوں سے دوچار نہیں ہوتے، لیکن چونکہ صغیر رحمانی نے دیہی سماج کی جیتی جاگتی تصویر کی عکاسی کی ہے تو ہمیں جان لینا چاہیے کہ آج بھی اس سماج میں ایسے کردار ہیں جو اپنے مالک کو اپنا خدا سمجھتے ہیں اور اس کے خلاف جانا گناہ کبیرہ سے کم تصور نہیں کرتے۔ پروفیسر ابوالکلام قاسمی کی ادارت میں شائع ہونے والے جریدے'' امروز'' کو دئے گئے ایک انٹرویو کے ایک سوال کے جواب میں سید محمد اشرف صغیر رحمانی کے ناول'' تخم خوں'' کے موضوع، پلاٹ اور کردار سے متعلق اظہار خیال کرتے ہیں کہ:

> ''۲۰۱۶ میں صغیر رحمانی کا ناول ''تخم خوں'' شائع ہوا ہے جو ایک ایسے موضوع پر ہے جو اردو میں کم لکھا جاتا ہے.
> ...صغیر رحمانی کے ناول تخم خوں میں بہار

کے دلتوں کا ذکر جس انداز میں ہے اور
وہاں احتجاج کا علم اٹھانے والے
دیہات کے غریبوں کا جس انداز میں
طویل بیانیے میں ذکر ہوا ہے وہ اس بات
کی راہ روشن کرتا ہے کہ اردو فکشن
بھی سمانتر کہانیوں کا جواب رکھتا
ہے۔تھیم، پلاٹ عام اردو داں طبقہ کے
لیے نامانوس کردار اور ان کے نام، مقامی
بولی اور بلاشبہ سینکڑوں اسمائے معرفہ کا
فطری استعمال اور ناول کی ہیروئن 'بلایتی'
کا کردار اسے ایک یادگار تخلیق
بناتا ہے۔، یادگار بھی اور مختلف بھی۔''

ناول کے دوسرے کرداروں میں مانجھی کا کردار متاثر کرتا ہے جو ابتدا تا آخر اپنے ارادوں کا پابند رہتا ہے اور اپنے ساتھیوں جئے چندرام اور سکھاڑی کے ساتھ مل کر تنظیم کے کام انجام دینے میں متحرک رہتا ہے۔ اگھورن کے کردار سے بھی صغیر رحمانی نے بڑی حد تک انصاف کیا ہے۔ وہ تشدد کے خلاف ہے اور نکسلی تحریک کے خلاف مظاہرہ کرتا ہے'' کرانتی کرنے والے ....؟ تم کب سے کرانتی کرنے والے ہو گئے ..؟ کرانتی کا بیسوا کا نتھ ہے جسے کوئی بھی اتار لے ...؟ کا ہے کھود سے منہ میاں مٹھو بنتے ہو...؟ .....'' کرانتی کرنے والے۔ کرانتی کاری... کمریڈ... اتنے سالوں میں ....پچھلے لگ بھگ چالیس پینتالیس سالوں میں کھون کھرابا کے الاوا کوؤن سی کرانتی کر دی ہے تم نے ...؟ کون سا بھلا کر دیا ہے تم نے غریبوں کا...؟'' (ص ۳۴۰)

یہ کلمات محض کلمات نہیں ہیں بلکہ اس بات کا اشارہ ہیں کہ ہندوستان میں نکسلی تحریک کے پوری طرح کامیاب نہ ہونے کے پیچھے بنیادی وجہ اس تحریک کا بے راہ روی کا شکار ہو جانا ہے۔

مجموعی طور پر یہ بات بلا تردید کہی جا سکتی ہے کہ ناول 'تخم خوں' میں زندگی کے بے رحم پہلوؤں اور عصری تقاضوں کے بدلتے نظام کی پیش کش اور دلت سائیکی، اسطبقے میں آنے والی فکری تبدیلیوں کو پیش کر کے صغیر رحمانی نے دلت لفظیات اور ترقی پسند جمالیات کا از سرِ نو ترتیب کا جواز پیش کیا ہے۔ زبان و بیان کے اعتبار سے بھی بہت صاف، سلیس اور سلجھا ہوا ناول ہے۔ اسی لیے بہاری معاشرہ کی بول چال، رسم و رواج کے بے حد قریب ہو گیا ہے ۔صغیر رحمانی نے جس مسئلہ کو اٹھایا اور جس معاشرہ کے حسن و قبح کو وہ منظر عام پر لانا چاہتے تھے اس میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ اپنے خیال کی تصدیق کے طور پر دیپک بدکی کا یہ قول نقل کرنا چاہوں گی جس کا اظہار انھوں نے اس ناول کے حوالے سے کیا ہے ملاحظہ ہو:

''''صغیر رحمانی نے ناول کو بہار کے سیاسی و سماجی تناظر میں پیش کیا ہے اور بڑی دقیقہ شناسی سے نہ صرف موضوع بلکہ کرداروں اور واقعات کو بھی چن لیا ہے ۔ بہار ایک ایسی جگہ ہے جہاں موسم، قانون اور سیاست پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ کب کون کیسا رنگ اختیار کر لے کسی کو نہیں معلوم ۔ ناول 'تخم خون' اسی معاشرے کو آئینہ دکھانے کی کامیاب کوشش ہے۔ ناول ظاہر ہے ایک بہت بڑا کینواس ہوتا ہے جس میں اگر ناول نگار چستی اور مرکزیت پر دھیان نہ دے، تو بیانیہ میں جھول پڑنے کا خطرہ منڈلاتا رہتا ہے ۔ اس حوالے سے ناول نگار کافی کامیاب رہے ہیں۔ برہمن واد اور سامنت واد پر مبنی یہ ناول دلت ڈسکورس پر ایک اچھا اضافہ ہے حالانکہ بعض جگہ قنوطیت حاوی ہو چکی ہے ۔ ناول میں موجودہ دور کی جمہوریت، افسر شاہی، رشوت خوری، پولیس کی زیادتیوں اور تصویری تشہیر کو بڑی ہنرمندی سے بیان کیا گیا ہے۔ ذات پات پر جوڑ توڑ، غنڈہ گردی، سرکاری عنانت و انفعالیت، اگڑوں کی حمایت اور پچھڑوں کی نظر اندازی، ووٹ کی سیاست

اور میکانیت وخودکاری کے اثر پر بھی خوب روشنی ڈالی گئی ہے۔ناول کو پڑھتے ہوئے ایسا لگتا ہے کہ ہماری دیہاتی زندگی پریم چند کے زمانے سے زیادہ آگے نہیں بڑھی ہے۔فرق صرف اتنا ہے کہ اس وقت بدیشی حکمراں تھے اور اب سویدیشی ہیں۔''

مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ ناول حساس ذہنوں کو جھنجوڑتا ہے اور کئی سوال قائم کرتا ہے۔نیز مباحث اور تفکر کے کئی در روشن کرتا ہے۔اس ناول کے توسط سے بآسانی سمجھا جا سکتا ہے کہ صدیوں سے چلی آرہی طبقاتی اونچ نیچ، ذات پات کی کشمکش اور غلامی کی بیڑیاں اب کمزور پڑ چکی ہیں۔پچھڑے اور پس ماندہ طبقے بھی اپنے حقوق وتحفظ کے تئیں بیدار ہوتے نظر آرہے ہیں۔جس کی بہترین نمائندگی ناول کی اہم کردار بلایتی بخوبی کرتی ہے۔مذہبی پیشواؤں سے لیکر شاطر سیاست دانوں تک پورا سماج دو متضاد رویوں کا حامل ہے۔دبے کچلے افراد اور عورتوں کے استحصال میں گرچہ اب تک کوئی کمی واقع نہیں ہوئی ہے اور نہ ہی مذہبی ٹھیکیداروں اور برہمن واد ذہنیت میں خاطر خواہ تبدیلی، تاہم ناول کے اختتام میں بلایتی کی کوکھ سے برہمن کے بچے کی پیدائش نسلی و ذاتی تعصب کے خاتمہ کا واضح استشارہ ہے۔دلت سائیکی پر مکالمہ قائم کرتا ہوا، اونچی ذات کی قلعی کھولتا ہوا، مفاد پرست اور خودغرض افراد کے مکروفریب کو بے نقاب کرتا ہوا یہ ناول ایک امید افزا روشن مستقبل کا ضامن ہے۔گویا ناول 'تخم خوں' ایک منفرد اہمیت و شناخت کی حامل تخلیق ہے جو کئی حیثیتوں سے قارئین کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

بیگ احساس

کا

ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یافتہ

افسانوں کا مجموعہ

دَخمہ

قیمت: -/200 روپے

عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی۔۹۵

(مراسلہ نگار کے خیالات سے ایڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے)

خطوط

جو وہ لکھیں گے جواب میں

محترم ــــــ السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ!

بخیر ہوں امید ہے آپ بھی خیریت سے ہوں گے۔ ساہتیہ اکادمی ایوارڈ کی مبارک باد قبول فرمائیں۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس خوشی کے موقعے پر تمام لوگوں کے ساتھ میں بھی فیس بک پر مبارک باد پیش کرنے میں کامیاب ہوا۔ پھر ٹیلی فون سے اور آج تحریری شکل میں اللہ کو اس سے زیادہ منظور نہ تھا کیوں کہ جب میں دھارواڑ مشاعرے کے سفر پہ تھا اور ایک دن کے لیے حیدرآباد ٹھہرا تھا اور آپ سے مل کر آپ کو ایوارڈ کی مبارک باد دینا چاہتا تھا لیکن آپ کی طبیعت کی ناسازی نے اس مبارک گھڑی کو مجھ سے چھین لیا اور میں اس اعزاز سے محروم رہا کہ آپ سے مل کر آپ کو مبارک باد پیش کرتا میں اسی حسن اتفاق کو بھی غنیمت سمجھتا ہوں۔

مصداق اعظمی۔ اعظم گڑھ

مکرمی!

حیدرآباد فرخندہ بنیاد سے شائع ہونے والا قدیم متوازن علمی وادبی ماہ نامہ سب رس ماہ مارچ 2018ء بروقت وصول ہوا جس کا ISSN 22701902 جلد 80، شمارہ 3، ہے مدیر پروفیسر بیگ احساس نے اداریہ میں خون آشام۔ شام میں شام کی حالت اور اس پر ظلم و بربریت اظہار تاسف وغم کرتے ہیں اب بھی شام کا مسئلہ حل نہیں ہوسکا چوطرف سے شام کو کمزور کردیا گیا۔ آپ نے سچ کہا کہ غیر جانب دار ممالک اسے روکنے کی کوشش کریں۔ UNO اور عالمی عدالت خاموش کیوں ہیں اس کا حل دریافت کر سکتے ہیں عبدالوہاب قاسمی اپنے مضمون ''مجتبیٰ حسین کا فن آخر کار کی روشنی میں کہتے ہیں۔ آخر کار کے مشملات پر غور کرتے ہوئے یہ بات بڑی شدت سے محسوس ہوتی ہے کہ مجتبیٰ حسین بین السطور کو بڑی محنت، مشاقی اور فنی مہارت ترتیب دیتے ہیں جہاں ہم پڑھتے کچھ اور شعوری لہر میں اترتا کچھ اور ہے ظرافت میں تہ در تہ معنی پوشیدہ رہتے ہیں معنی کی پرتیں کھولنا پڑتا ہے دیمک کی ملکہ میں یہی خوبی ہے۔ حلیمہ فردوس نے نسائی شاعری کا لہولہو منظر نامہ میں خواتین شاعرات اور نثر نگاروں کی تخلیقات کا حوالہ دیتے ہوئے سماج کی ناہمواریاں سماج کا کرب اور خواتین کے مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔ محمد زاہد الحق نے شاعر انقلاب جو ملیح آبادی کی ناقدانہ بصیرت پر حوالوں سے روشنی ڈالی ہے کل تک ہم جوش کو شاعرِ انقلاب و شاعرِ شباب سمجھتے تھے۔ موصوف نے ان کی نثری کتاب یادوں کی برات آپ بیتی سے تنقیدی حوالے دیئے ہیں ویسے انھوں نے تنقید پر کوئی کتاب نہیں لکھی۔ ادب میں شاعر کی حیثیت سے معروف مقبول ہیں ویسے تخلیق کار پہلے نقاد ہوتا ہے بعد میں شاعر انھوں نے باقاعدہ تنقیدی کتابیں نہیں لکھی ہیں۔ مسرت جہاں نے انتظار حسین کا آخری آدمی تقلیب آدم کا بیانیہ میں اچھا تجزیہ کیا ہے۔ رپورتاژ میں ایوارڈ یاترا، بیگ احساس نے پوری جزئیات کے ساتھ ایوارڈ لینے جانے پہلے سے لے کر واپسی تک موثر انداز سے حالات واقعات، احساسات، جذبات کو پیش کیا ہے ہر پہلو کو متاثر کن انداز سے پیش کیا ہے دیگر ذیلی عنوانات کے تحت مشمولات عصری تقاضے لیے ہوتے ہیں۔ طنز و مزاح، شاعری، افسانے، خراج عقیدت، وغیرہ بہت خوب او رمعلومات سے پُر ہیں۔ میں پھر ایک مرتبہ پروفیسر بیگ احساس کو سنٹرل ساہتیہ اکادمی ایوارڈ ملنے کی خوشی میں دل سے مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ اور دعا کرتا ہوں اللہ صحت کے ساتھ مزید اردو ادب میں اضافہ کرتے رہیں۔ معیاری رسالے کی اشاعت پر مدیر اور ان کے رفقا کار کو مبارک باد دیتا ہوں! 21 ویں صدی میں ایسے معیاری رسالے انگلیوں پر گننے کے لائق ہیں۔ **ڈاکٹر محمد ناظم علی۔ حیدرآباد**

رضا علی عابدی

رپورٹ

لندن والوں نے ساقی کی یادمنائی

لندن والوں نے پچھلے دنوں ساقی فاروقی کو یاد کیا۔ کیسا اچھا شاعر تھا، کیسا خاتمہ کیا اپنے ہی ہاتھوں۔ ساقی نے زندگی کے کوئی پچاس برس لندن میں گزارے۔ ان تمام برسوں میں وہ شعر کہتا رہا لیکن دوسرے بہت سے شاعروں کی طرح وہ بھی برطانوی شاعر نہیں کہلایا۔ لندن میں رہ کر بھی وہ اردو دنیا کا شاعر ٹھہرا اور جہاں تک اس کی شہرت پہنچی، وہاں تک بلکہ اس سے بھی آگے اس کے اشعار پہنچے۔ ساقی عام شاعر نہیں تھا، اسے گھسی پٹی روایتی شاعری سے چڑ تھی اور شعر گوئی کی دنیا میں اس کا نعرہ بہت مقبول تھا کلیشے توڑو، کلیشے توڑو۔ خود ساقی نے اپنی نئی راہیں نکالیں، پرانے اسلوب کے بت توڑے اور اس پر دہ عنوان اترے جن تک دوسروں کی فکر کی رسائی بھی نہ ہوگی۔ چنانچہ لندن والوں نے ساقی کا سوگ نہیں بلکہ اس کی کامیاب زندگی کا جشن منانے کی ٹھانی۔ شہر کی ایک مقبول تنظیم سوسائٹی آف فرینڈز انٹرنیشنل نے جسے عرف عام میں سوفی اور غلط العام میں صوفی کہا جاتا ہے، لندن کے وسط میں ایک بڑی محفل کا اہتمام کیا۔ اس میں ساقی کے دوست، احباب، مداح اور پرانے واقف کار جمع ہوئے اور سوفی کے کرتا دھرتا مصطفیٰ علی خاں نے نہایت قرینے سے محفل کو آراستہ کیا۔ لمبی لمبی اور اکتا دینے والی تقریروں سے اجتناب کی یہ صورت تھی کہ چھپے ہوئے پروگرام میں لکھا تھا: ابتدائی کلمات، عدیل صدیقی، دس جملے اور پروگرام کے آخر میں تحریر تھا اختتامی کلمات، پانچ فقرے۔

پوری تقریب یوں تو ساقی کے کلام پر مرتب کی گئی تھی۔ صرف ایک اقتباس مشتاق احمد یوسفی کی تحریر سے پڑھا گیا جس کا ذکر آگے آئے گا۔ شروع ہی میں صبیحہ صدیقی اور دردانہ انصاری نے جن کے ترنم کو شہرت حاصل ہے، ساقی کے اشعار لحن سے پڑھے۔ اس کے بعد ساقی کے کلام کے وہ اوراق کھولے گئے جو اس کی وجہ شہرت بنے، یعنی ساقی کی نظمیں۔ یہ وہ میدان ہے جس میں ساقی کی تخلیقی صلاحیتوں نے خوب خوب جوہر دکھائے اور جدید شاعری کی جن خوبیوں پر دنیائے اردو کی نگاہ کم جاتی ہیں ان کو ساقی نے کیسے کیسے برتا، اس شام خوب خوب سنا اور سراہا گیا۔ عروج آصف نے جو ابھرتی ہوئی شاعرہ ہیں ایک نظم پیش کی، پھر رفعت شمیم نے جن کو ڈرامے کا فن خوب آتا ہے، ایک اور نظم کو تصویر کی صورت پیش کیا۔ اسی طرح ساقی کے قریبی دوست ارشد لطف نے ساقی کی ایک ذرا طویل نظم سادگی مگر خوبی سے پڑھی۔ میں یہاں وہ نظمیں تو نقل نہیں کروں گا البتہ ان کے موضوع پر پڑا ہوا پردہ سرکاؤں گا۔ مثال کے طور پر ان کی نظم مکڑا بظاہر اس مکڑے کے بارے میں ہے کہ اسے چھیڑو تو اپنے دفاع کی خاطر سکڑ کر اپنا سب کچھ بند کر لیتا ہے۔ ساقی نے اس کی یہ خوبی اپنے اندر بھی محسوس کی۔ اسی طرح ایک نظم اس بلے کے بارے میں ہے جسے جان محمد خاں پٹ سن کے بورے میں بند کر کے کہیں دور چھوڑ آنے کے لیے اپنی پیٹھ پر لاد کر لے جا رہے ہیں۔ راہ میں بلّے کے احساسات کو مصرعوں میں ڈھالا گیا ہے۔ ساقی کی ایک اور بہت ہی جیتی جاگتی نظم تحت اللفظ پڑھی گئی جس کا خیال عورتوں کی بے بسی اور ان کے حقوق سے لیا گیا۔ نظم میں دادی امّاں کی کیفیت بیان ہوئی ہے جو شادی کے بعد عمر بھر کے عذاب جھیلتی ہیں اور ہر صعوبت کا تریاق مانگتی ہیں، آخر وہ دن آتا ہے جب بقول ساقی، دادی امّاں طلاق مانگتی ہیں۔

مکڑے اور بلّے کے احوال کے بعد میں یوسفی صاحب

کے مضمون کا ایک حصہ نقل کرتا ہوں ساقی کے اپنا کلام پڑھنے کی خوبی بیان کرتے ہوے اپنے مخصوص انداز میں لکھتے ہیں: ''ساقی نے مینڈک، کتے، بلے، خرگوش، مکڑے وغیرہ پر بہت خوب صورت اور خیال انگیز نظمیں لکھی ہیں۔ وہ چار ٹانگوں سے کم کسی ذی روح سے محبت نہیں کر سکتے''۔ اس کے بعد ساقی کے شعر پڑھنے کے انداز پر یوسفی صاحب کا کہنا بھی خوب ہے۔ ''پڑھت اس قیامت کی کہ ایک ایک لفظ کو زندہ کر کے سامنے لا کھڑا کرتے ہیں۔ خرگوش، کبڑے یا مینڈک پر نظم پڑھتے ہیں تو بالکل وہی بننے کی بڑی کامیاب کوشش کرتے ہیں۔ ایسی ڈرامائی طرز ایجاد کی ہے جس میں اپنے تمام اعضا استعمال کر کے سننے والے کے پانچوں حواس پر چھا جاتے ہیں۔''

اس شام کی دو بڑی خوبیوں کا ذکر رہا جاتا ہے۔ برطانیہ کے سرکردہ گلوکار آصف رضا نے ساقی کی کئی غزلوں کو نغموں میں ڈھالا۔ انہوں نے جس خوبی سے طرزیں بٹھائیں، اسی نفاست سے اپنی آواز کا جامہ بھی پہنایا۔ اور آخر میں شام کا سب سے زیادہ حیران کرنے والا واقعہ ہوا اور ہندوستان کی ارونما نے رقص پیش کیا جس کی خوبیاں دیکھ کر مجمع ششدر رہ گیا۔ یہ رقص ساقی کی غزلوں پر سجائے گئے تھے۔ جنہیں آصف رضا گا رہے تھے اور طبلہ نواز محمد عامر کا ٹھیکہ رقص کی تھاپ کا ساتھ نبھا رہا تھا۔ ساقی کے ہر بول کو ارونما بدن کی حرکات سے ظاہر کر رہی تھیں اور وہ بھی اس خوبی سے کہ اگر ساتھ ساتھ بول نہ گائے جاتے تو صاف معلوم ہو جاتا کہ شاعر نے کیا کہا ہوگا۔ ماحول میں رنگ بکھیرتے رقص کے ساتھ اور پانچ فقروں کے اختتامی کلمات پر ساقی کو خراج عقیدت کا سلسلہ تمام ہوا۔ ساقی کے ایک گہرے دوست نے کہا کہ آج کی شام وہ ہوتے تو کتنے خوش ہوتے۔ میں نے کہا کہ ساقی کی برہمی اور غصہ مشہور تھا۔ کیا عجب کہ آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑتے۔ اسی بات پر میں نے لندن کے اس مشاعرے کا حال سنایا جس میں ساقی موجود تھے۔ اسی مشاعرے میں دو امریکی خواتین بھی کسی طرح آ گئی تھیں۔ ہوا یہ کہ ایک شاعر اپنا کلام ترنم سے پڑھنے لگے۔ امریکی خواتین سمجھیں کہ یہ گانا ہے جس کے ساتھ رقص اچھا لگے گا۔ یہ سوچ کر دونوں الٹا سیدھا ناچنے لگیں۔ بس پھر کیا تھا۔ ساقی پھٹ پڑے اور پھر وہ ہڑبونگ مچی کہ سارا مشاعرہ غارت ہوگیا۔

اس شام بھی شعروں پر رقص ہو رہا تھا۔ مگر ایسا رقص کہ ساقی ہوتے تو کچھ اور بات ہوتی۔

(بہ شکریہ: جناب مجتبیٰ حسین)

☆☆☆

سب رس انٹرنیٹ پر

Sherosokhan.net پر پہلے صفحے پر اوپری جانب انگریزی سرخیوں میں ''برقی کتب'' کے عنوان پر کلک کرنے پر ''سب رس'' کے شمارے پڑھے جا سکتے ہیں۔ صفحہ اول پر ہی ایک نشان ''سب رس'' کا ہے اس پر کلک کر کے تازہ شمارہ پڑھا جا سکتا ہے۔

سب رس

ادارۂ ادبیات اردو کا رسالہ ہے۔ جس کو کوئی سرکاری امداد نہیں ملتی اعزازی کاپی طلب فرما کر ہمیں شرمندہ نہ کیجیے۔

پریس ریلیز

ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام 'نوجوان اردو قلمکار کانفرنس' کا شاندار انعقاد

گزشتہ روز ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام 'نوجوان اردو قلمکار کانفرنس' کا انعقاد عمل میں آیا جس میں ملک کے مختلف حصوں سے تشریف لائے نوجوان افسانہ نگار اور شاعروں نے شرکت کی۔ صدارتی فرائض سینئر ادیبوں نے ادا کیے۔ کانفرنس کا افتتاح اردو کے مشہور ریسرچ جرنل 'عالمی اردو ادب' کے مدیر اور فکشن رائٹر جناب نند کشور وِکرم نے کیا۔ انھوں نے اپنے افتتاحی خطبہ میں نوجوانوں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ وہ نئی تکنیک کا بہتر استعمال کرتے ہوئے اپنے تجربات کے اظہار میں وسعت پیدا کریں۔ انھوں نے زبان کو احتیاط کے ساتھ برتنے کی بھی اپیل کی۔ ساہتیہ اکادمی اردو مشاورتی بورڈ کے نومنتخب کنوینر اور اردو کے معروف شاعر جناب شین کاف نظام نے ابتدائی کلمات ادا کیے اور کہا کہ ان کی کوشش ہوگی کہ ساہتیہ اکادمی کے اردو پروگراموں میں ان ادیبوں کی بھی شمولیت ہو جو اب تک اکادمی کے منچ تک نہیں پہنچ پائے ہیں۔ صدارتی خطبہ اردو کے سینئر شاعر اور مجاہد آزادی پنڈت آنند موہن زتشی گلزار دہلوی نے کی۔ انھوں نے آٹھ دہوں پر محیط اپنے تجربات کو نوجوان قلمکاروں سے ساجھا کیا اور اپنی کچھ رباعیاں بھی سنائیں۔

پہلا اجلاس جو 'افسانہ خوانی' کا تھا، کی صدارت اردو کے معروف فکشن نگار مشرف عالم ذوقی نے کی اور افسانہ نگاروں کو اپنے مشوروں سے نوازا۔ اس اجلاس میں سالک جمیل براڑ، محمد ہادی اور شہناز رحمٰن نے اپنی کہانیاں پیش کیں۔ شہناز رحمٰن کی کہانی 'راج محل' نیپال کی راج شاہی پس منظر پر مرکوز تھی۔ سالک جمیل براڑ کی کہانی 'بوجھ' کسان زندگی پر مبنی تھی جس میں ایک بوڑھا کسان اپنے بوڑھے بیل کی حالت سے اپنا موازنہ کرتا ہے۔ محمد ہادی کی کہانی 'گھونسلا' شہری زندگی کے تجربات سے پُر تھی جس میں یہ گہری فکر بھی شامل تھی کہ کیسے ہم کتابوں سے دور ہونے کے ساتھ جذبات سے بھی دور ہوتے جا رہے ہیں۔

آخری اجلاس 'شعری نشست' کی صدارت پروفیسر شہزاد انجم نے کی جس میں عادل رضا منصوری، وِشال کھلّر، جتندر پرواز، خان محمد رضوان، فرمان چودھری، فوزیہ رباب اور قسیم اختر نے اپنی بہترین غزلیں اور نظمیں پیش کیں جس کی سامعین نے خوب داد دی۔ صدارتی خطبے میں شہزاد انجم نے اس سبھی شاعروں کو مبارکباد پیش کی اور اکادمی کو ایسے پروگرام کے انعقاد کے لیے شکریہ ادا کیا۔ اظہارِ تشکر ڈاکٹر دیویندر کمار دیویش نے کی۔

صغیر افراہیم

Professor & Chairman

Dept of Urdu, Aligarh Muslim University

Aligarh - 202 001

حبیب نثار

Professor & Head Dept of Urdu

University of Hyderabad, Hyderabad 500 046

عبدالحئی

253, Pariyar Hostel,

Jawaharlal Nehru University, New Delhi

پی پی سریواستورند

R-16, Sector -XI, Noida - 201 301

مسلم نواز

12-3-H/1, Patwar Bagan Lane,

Kolkata - 700 009

مصداق اعظمی

Jawma, Mejwa, Phoolpur, Azamgarh,

Uttar Pradesh - 276 304

ہارون شامی

3/137, Vivek Khand, Gomti Nagar,

Lucknow - 226 010

بدر محمدی

Chandpur Fatah, P.O. Bariarpur

Dist: Vaishali (Bihar) - 843 102

انور ادیب

8, Muslim Library Bistopur,

Jamshedpur 831 001 Jharkhand

احمد نثار

Kids Campus School, Mohammad Ali Raod

City Colony, Post-B, Dist: Dhanbad

Jharkhand - 828 130

بلراج بخشی

13/3, Eidgah Road, Adarsh Colony,

Udhampur - 182 101

مشتاق احمد وانی

Asst. Prof. Dept of Urdu

Baba Ghulam Shah Badshah University,

Rajouri J& K

انجم پروین

Research Scholar, Dept. of Urdu,

Aligarh Muslim University, Aligarh

نواب میر عثمان علی خاں آصف سابع کے دورِ حکومت کا ایک روپیہ

Regd. No. RNP/HD/970/2018-20 RNI No. 10922-57

THE "SABRAS" URDU MONTHLY

ORGAN OF IDARA-E-ADABIYAT-E-URDU

Rs. 30/- Vol.80, Issue-05 May, 2018 Date of Publication 15th & Postal Date 20th of every month.

سیاست

حیدرآبادی دور،
ثقافت اور طرز زندگی کا
مصدقہ عکاس!

سیاست آج ملک کے معتبر اردو روزناموں میں اپنی نوعیت کا ایک منفرد اخبار ہے۔ **سیاست** نے دیگر ممالک میں بسے ہوئے اردو وقارئین کی روز مرہ کی زندگی میں اپنا ایک نمایاں مقام بنایا ہے۔ اخبار کی روزانہ بذریعہ طیارہ مشرق وسطیٰ، یو کے، یو ایس اے اور کینڈا ترسیل عمل میں آتی ہے۔

...اور وہ حیدرآبادی حضرات جو اپنے وطن سے دور ہیں، **سیاست** کے مطالعہ کے بعد خود کو حیدرآباد میں ہی محسوس کرتے ہیں۔ سیاست کی ویب سائیٹ کے ذریعہ انہیں حیدرآبادی ثقافت، مناظر، ذائقہ اور گنگا جمنی تہذیب اور روایات تک رسائی حاصل ہوتی ہے۔ ایک ایسی ویب سائیٹ جسے 107 ممالک سے روزانہ چار لاکھ ہٹس موصول ہوتے ہیں۔

سیاست نے اردو زبان سے واقف قارئین کے دلوں تک رسائی حاصل کر کے ایک بار پھر بطور روزنامہ اپنی مقبولیت کو ثابت کر رہا ہے۔

روزنامہ سیاست حیدرآباد

The Siasat Daily

J.N. Road, Abids, Hyderabad - 500 001 (A.P.)
Tel : 24744180, 24603666, 24744109, 24744114
Fax : Editorial : 040-24603188, Advertisement : 24610379
Website : www.siasat.com, E-mail : siasat.daily@yahoo.com

حیدرآباد کا دوسرا نام سیاست

Printed and Published by Prof.S.A.Shukoor on behalf of Idara-e-Adabiyat-e-Urdu,
Printed at Taahaa Print Systems, Lakdi-ka-pul, Hyderabad and Published at Idara-e-Adabiyat-e-Urdu
Aiwan-e-Urdu, Panjagutta Road, Somajiguda, Hyderabad-500 082 (T.S.) Editor : Prof. Baig Ehsas Ph : 040-23310469